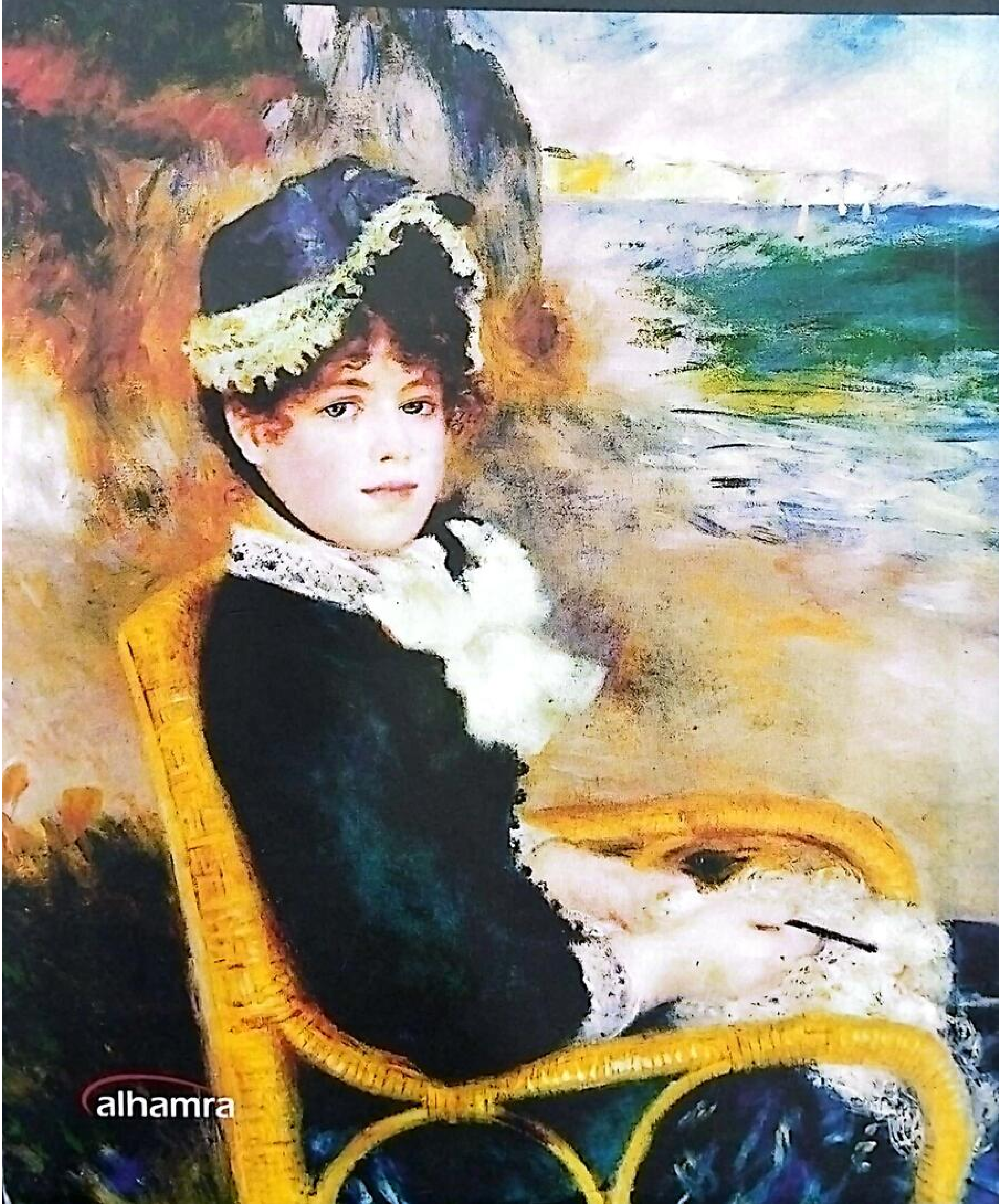
موپاساں
کی شاہکار کہانیاں - 1



alhamra

Maupassant

موپاساں

کی شاہکار کہانیاں - 1

اُردو ترجمہ
شوکت نواز خان نیازی

alhamra

یہ کتاب الحمرا پبلشنگ نے، سفارت خانۂ فرانس، اسلام آباد، پاکستان
اور فرانسیسی وزارت برائے امورِ خارجہ کے تعاون کے ساتھ،
اشاعتی پروگرام پ آپ محمد اقبال، کے تحت شائع کی ہے۔

اس مجموعے میں شامل کہانیاں موپاساں کے دو مجموعوں Boule de Suif et autres contes normandes اور Contes du jour et da la nuit سے لی گئی ہیں۔

طبع اول: فروری 2006
ناشر: شفیق ناز۔الحمرا پبلشنگ۔اسلام آباد

فرانسیسی زبان میں کتاب کا نام: Original Title in French:
Boule de Suif et autres contes normandes
Contes du jour et da la nuit
by: Guy de Maupassant

Alhamra Publishing, Islamabad, Pakistan
Printed in Pakistan

ISBN: 969-516-167-6

ترتیب

اس کتاب میں شامل ناولٹ اور کہانیاں کسی مخصوص موضوع کے اعتبار سے ترتیب نہیں دی گئیں۔ تاہم سب کہانیاں موپاساں کے طرزِ تحریر کی آئینہ دار قرار دی جا سکتی ہیں۔ سبھی کہانیوں میں انسانی جذبات کے تاریک ترین نہاں خانوں کو کریدا گیا ہے۔ انسانی برتاؤ اور فیصلوں پر بیرونی اثرات کے برعکس دوسرے انسانوں کے فیصلوں کا کیا اثر ہوتا ہے، موپاساں کے کردار انہی بلندیوں اور پستیوں کے عکاس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موپاساں کے کردار افسانوی اور رومانوی نہیں ہیں بلکہ اپنے ارد گرد دکھائی دینے والے جیتے جاگتے لوگ ہیں۔

''چکنی'' ایک ایسی طوائف کی داستان ہے جو سماج کے ٹھیکیداروں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے جن کا مقصدِ حیات اپنی سماجی اور معاشی حیثیت (دولت، نام و نسب، مذہب اور نظریات) کو ہر حال میں برقرار رکھنا ہے۔ ۱۸۸۰ء میں فرانس پر جرمن یلغار کے پس منظر میں لکھے گئے اس ناولٹ میں ان استحصالی امراء شرفاء کلیسا کے پیروکاروں اور قومیت پرستوں کی تصویر کشی کی گئی ہے، جو سماج کے ایسے طبقوں سے، جنہیں عموماً حقارت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے، اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے قربانیوں کی توقع کرتے ہیں۔

''خدا حافظ'' بڑھاپے کی پھیلتی شام کے سائیوں میں جوانی کی خوبصورت یادوں پر ایک اثر انگیز تحریر ہے۔ ''لے پالک'' بھوک و افلاس اور اولاد سے محبت کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ مایوسی کے اندھیروں میں گھرا ایک نوجوان اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے کس

حد تک جا سکتا ہے اس کا اندازہ ''اعترافِ گناہ'' میں کیا جا سکتا ہے جبکہ ''اعتراف'' میں جوانی کی ایک لغزش عمر بھر کے پچھتاوے کا باعث بن جاتی ہے۔ ایک عاشق کا عشق کیسے دیوانگی کی صورت اختیار کر سکتا ہے اس کی عکاسی ''فسوں'' میں کی گئی ہے۔ ''ہیروں کا سیٹ'' موپاساں کی وہ کہانی ہے جس کا اردو زبان میں غالباً سب سے زیادہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ مفلوک الحال کسانوں کی اخلاقی اقدار کے موضوع پر لکھی گئی کہانی ''سودا'' قاری کے منہ میں ایک کڑواہٹ چھوڑ جائے گی۔ ''باپ'' اور ''متا'' میں پدرانہ محبت اور شفقت انتہائی اچھوتے حوالوں سے سامنے لائی گئی ہے۔ ''خود کشی'' قاری کو حسرت و یاس اور محرومیوں کے اندھیروں میں لے جاتی ہے۔ ''اصلی نقلی'' ایک ایسے سادہ لوح شوہر کی کہانی ہے جو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت کرتا ہے اور ''قتل'' ایسے ماں باپ کی کہانی ہے جو اپنے ناجائز بیٹے کو قبولیت کے سوا سب کچھ دینا چاہتے ہیں۔ اس مجموعے کی آخری کہانی ''سیموں کا باپ'' شائد وہ واحد تحریر ہے جو قدرے ہلکی پھلکی اور خوشگوار ہے۔

یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ موپاساں کو پڑھنے کے بعد کسی بھی قاری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جائے گی البتہ اس بات کے امکانات ضرور ہیں کہ قاری اس کتاب یا اس میں شامل کسی بھی کہانی کو پڑھنے کے بعد زندگی کی ستم ظریفی اور انسانی کمزوری پر ایک نئے انداز سے نظر ڈالنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس کتاب میں چند لمحوں کی ہلکی پھلکی تفریح تلاش کرنے والوں کو مایوسی کا سامنا ہو گا۔

انسانی کردار کے تاریک ترین پہلوؤں کی گہرائیوں میں اترنے والوں کو خوش آمدید۔

مترجم

فہرست

گی دموپاساں

Guy de Maupassant

ماہ وسال کے آئینے میں

۱۸۹۰ء میں لکھے ایک خط میں گی دموپاساں اپنی ذاتی زندگی میں دوسروں کی دخل اندازی سے شدید بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے، ''بہت عرصہ ہوا میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی تصویر اور اپنی سوانح حیات چھپنے کی اجازت کبھی نہ دوں گا کیونکہ کسی شخص کے چہرے اور اس کی ذاتی زندگی پر عوام کا کوئی حق نہیں ہوتا۔''

۱۸۹۳ء میں موپاساں کی وفات پر پال بُورژے (Paul Bourget) نے موپاساں کی اس بیزاری کا ذکر کچھ یوں کیا۔ ''ایک طرف موپاساں ساری زندگی اپنی شخصیت کے نہاں خانوں کو عوام الناس کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی حتیٰ المقدور کوشش میں مصروف رہا تو دوسری جانب اس کے قریب ترین دوستوں میں کسی ایک نے بھی اس کی اس دلی خواہش کا احترام نہ کیا۔''

موپاساں کی اس خواہش کا احترام آج تک ہوا اور نہ ہو گا۔

۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۲ء تک: بچپن اور لڑکپن

ہنری رینے البرٹ گی دموپاساں کی پیدائش ۵ اگست ۱۸۵۰ء کو غالباً فیکاں (Fecamp) کے گاؤں میں ایک متوسط خاندان میں ہوئی۔ اس کے دادا کا شمار نیویل

شاں دؤازیل (Neuville-Champ d'Oisel) کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ اس کے والد گستاف موپاساں کو، جو پیرس میں حصص کی خرید و فروخت کا کام کیا کرتا تھا، وراثت میں اپنے باپ سے اچھی خاصی جائداد ملی۔ گستاف موپاساں نے ۹ نومبر ۱۸۴۶ء کو گستاف فلوبرٹ (Gustaf Flaubert) کی بچپن کی دوست لور لپواتویں (Laure Le Poittevin) سے شادی کی۔ مالی طور پر آسودہ خاندان سے تعلق رکھنے والی اور اطوارِ اشرافیہ سے دیوانگی کی حد تک متاثر اس کی ماں نے شادی سے چند روز قبل ہی اپنے ہونے والے شوہر کو اپنے نام میں ''de'' کا اضافہ کرنے پر مجبور کر دیا کیونکہ امراء کے القابات میں ایسے حروفِ جار پائے جاتے ہیں۔ اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ گی دموپاساں کے والد نے یہ شادی صرف پیار محبت کی خاطر نہیں کی تھی۔ گی دموپاساں کی پیدائش کا اعلان بھی ولادت کے چند دن بعد کیا گیا جب اس کے والدین میرومیزنل (Miromesnil) کے علاقے میں واقع ایک محل میں جا بسے، تاکہ نومولود کی پیدائش کے اندراج میں محل کا نام درج ہو سکے۔ ۱۸۵۶ء میں گی دموپاساں کے چھوٹے بھائی ایروے دموپاساں (Herve de Maupassant) کی ولادت ہوئی۔

۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۷ء تک: نوجوانی

۱۸۶۳ء میں گی دموپاساں کو ایوطوط (Yvetot) کے مذہبی مدرسے میں چھٹی جماعت میں داخل کرایا گیا جہاں وہ دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس جیسے عقلمند لڑکے کو، جسے کھلے پر فضا مقامات پر کھیلنے کودنے کی عادت اور قدرتی مناظر سے محبت ہو چکی تھی، مدرسے کا کڑا مذہبی ماحول اور سخت نظم و ضبط قطعی پسند نہ آیا۔ یہیں اس نے گرامر، ریاضی اور لاطینی زبان کے ابتدائی مراحل طے کیے۔ اس دوران گی دموپاساں کے والدین کے درمیان تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔ دونوں کے مزاج قطعاً مختلف تھے۔ گستاف دموپاساں خوش پوش اور قدرے رنگین مزاج واقع ہوا تھا۔ جبکہ اس کی بیوی سخت مزاج، رسم و رواج کی پابند اور بے حد حساس طبیعت کی مالک تھی جسے سر درد کے اتنے شدید دورے پڑتے تھے کہ اس کی شخصیت ہی بدل جاتی۔ وہ کلاسیکی ادب کی دلدادہ اور خاص طور پر شیکسپیئر کی شیدائی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں چودہ

سال کے ساتھ کے بعد دونوں کے درمیان علیٰحدگی ہو گئی اور بچوں کی پرورش کا فرض ماں کو سونپ دیا گیا جو دونوں بچوں کو لیکر ایتریطا (Etretat) کے علاقے میں واقع ایک گاؤں وِیر گوئی (Verguies) میں آ بسی۔

چھٹیوں کے دوران اپنے چند دوستوں کے ساتھ گی دموپاساں نے انگریز شاعر سوین برن (Swinburne) کو ڈوبنے سے بچایا۔ اس پر مشکور شاعر نے اسے اپنے ایک دوست کے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ وہیں گی دموپاساں نے ایک استخوانی انسانی ہاتھ دیوار پر ایستادہ دیکھا۔ اس ہاتھ نے اسے اتنا متاثر کیا کہ اس نے بعد میں دو کہانیاں اسی ہاتھ کے موضوع پر لکھیں۔ ۱۸۶۸ء میں اسے ''مذہب سے بیزاری اور دیگر الزامات'' کے تحت مدرسے سے نکال دیا گیا۔ اسی سال وہ رُوآں کے شاہی کالج میں داخل ہوا جہاں سے اس نے علمِ بدیع و معانی پر دسترس حاصل کی اور اپنی پہلی نظمیں کہیں۔ لوئی بوئیلے (Louis Bouilhet) نامی ایک شاعر نے جو رُوآں کی لائبریری کا مہتمم تھا ابتدائی دنوں میں اس کی اصلاح کی اور اس کا تعارف فلوبرٹ (Flaubert) اور کروائسے (Croisset) سے کرایا۔ ۱۸۶۹ء میں بوئیلے کی وفات کے بعد فلوبرٹ نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ساتھ ہی اس نے شاعری کو خیرباد کہہ دیا اور اپنی پوری توجہ افسانے اور کہانیوں پر مرکوز کر دی۔ یوں ان دونوں میں استاد اور شاگرد کا ایسا بندھن استوار ہو گیا جو فلوبرٹ کی وفات تک قائم رہا۔ ۲۷ جولائی ۱۸۷۰ء کو موپاساں نے باکالوریا (Baccalaureat)(۱) کی سند حاصل کی۔ چند ماہ بعد وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے پیرس پہنچ گیا۔

۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۰ء تک: فلوبرٹ کے سایہ عاطفت میں

۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ لام بندی میں بیس سالہ موپاساں کو درجہ دوئم کے سپاہی کی حیثیت سے رُوآں میں تعینات کیا گیا۔ فطری طور پر محبِ وطن موپاساں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے ارد گرد فرانسیسی فوجوں کو پے در پے شکست سے دوچار ہوتا دیکھتا رہا۔ جنگ اور اس کے دوران پیش آنے والے واقعات آنے والے دنوں میں اس کی متعدد کہانیوں کا محور بنے۔ اس کا مشہور ناولٹ ''چکنی'' (Boule de Suif) خاص

طور پر اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے

۱۸۷۲ء میں موپاساں کو وزارتِ بحریہ اور پھر وزارتِ تعلیم میں ملازمت ملی۔ لیکن وہ دفتری زندگی سے جلد ہی اکتا گیا۔ وہ ڈانس ہال کی رنگینیوں اور وہاں پائے جانے والے حسن و جمال کے جلووں کا دلدادہ تھا۔ خوب سے خوب تر نظر آنے کی جستجو نے اسے جسمانی کسرت کی جانب راغب کیا اور انہی دنوں میں وہ ہمیشہ کے لئے کشتی رانی کا شیدائی ہو گیا۔ موپاساں اس دوران فلوبرٹ کی کڑی نگرانی میں تحریر و تخلیق کے مراحل طے کرتا رہا۔ یہ فلوبرٹ ہی تھا جس نے موپاساں کو جلد بازی میں اپنی تخلیقات عوام النّاس کے سامنے پیش کرنے سے روک دیا تھا۔ فلوبرٹ ہی کہ سرپرستی میں اس کی ملاقاتیں زولا (Zola)، گونکور (Goncourt)، دودے (Daudet) اور ھیسماں (Huysmans) جیسے عہد حاظر کے عظیم ترین فرانسیسی لکھاریوں، سیزاں (Cezanne) جیسے شہرہء آفاق مصوّروں اور تائین (Taine) اور ریناں (Renan) جیسے نامی گرامی دانشوروں سے ہوئی۔

فروری ۱۸۷۵ء میں موپاساں کی پہلی کہانی ایک قلمی نام کے تحت شائع ہوئی۔ کہانی کا نام ''استخوانی ہاتھ'' تھا۔ ۱۸۸۰ء میں اس نے اپنا پہلا ناولٹ ''چکنی'' تحریر کیا جس پر فلوبرٹ نے کہا، ''ایسی ہی درجن بھر کہانیاں لکھ ڈالو تو تم اپنا نام کمانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔'' اس ناولٹ نے راتوں رات موپاساں کو اعلیٰ پائے کے کہانی نویس کے طور پر پیش کیا۔ جدید ادبی تاریخ میں ایسے شواہد کم پائے جاتے ہیں کہ کسی ادیب نے اپنی پہلی کاوش میں ہی ایسی مکمل اور عمدہ مہارت کا ثبوت دیا ہو۔

۱۸۸۰ء میں ہی موپاساں کا ایک منظوم مجموعہ ''Des Vers'' کے نام سے چھپا۔ ۱۸۸۰ء کا سال جہاں ایک طرف موپاساں کے لئے کامیابیوں کی نوید لے کر آیا تو دوسری طرف اسی سال فلوبرٹ مرگی کا دورہ پڑنے سے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ انہی دنوں میں موپاساں نے آتشک کی ابتدائی علامات محسوس کیں۔

۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک: ذاتی زندگی اور زورِ قلم

ابتدائی کامیابی کی بنا پر موپاساں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ایک

جریدے گولوآز (Gaulois) کے لئے مضامیں لکھنا شروع کر دیا۔ ایک ہی سال میں گولوآز، ژیل بلاس (Gil Blas) فیگارو (Figaro) اور لیکو دپاری (L'Echo de Paris) جیسے مقتدر جرائد میں اس کے مضامین باقاعدگی سے چھپنے لگے۔ اس دوران وہ جہاں نوردی میں بھی مصروف رہا۔ گولوآز ہی کے لئے مضامین لکھنے کی خاطر اس نے کارسیکا، الجیریا، مراکش اور تیونس کا سفر بھی کیا۔ ۱۸۸۱ء میں اس کا دوسرا ناولٹ "لا میزاں تیلئے" (La Maison Tellier) چھپا جس کی کامیابی نے یہ ثابت کر دیا کہ "چکنی" کی کامیابی محض اتفاق نہ تھا۔

۱۸۸۳ء میں موپاساں نے پراسرار کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا۔ اسی سال اس کا پہلا ناول "ایک زندگی" (Une Vie) چھپا جو چار سال کی کاوش کا نتیجہ تھا۔ یہ ایک ایسی عورت کی المیہ داستان ہے جو اپنی زندگی، شادی، شوہر اور بالآخر اپنے بیٹے کے ہاتھوں غم واندوہ کی تصویر بنی رہتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جدید ادب میں تفصیلی مشاہدے اور المناک حالات کے حوالے سے اس سے عمدہ مثال نہیں پائی جاتی۔ ناول میں رنج والم کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ پورے فرانس کے ریلوے سٹیشنوں پر واقع کتب فروشوں پر اس کتاب کی فروخت پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ اس دوران اس نے لیتریطا میں ایک گھر تعمیر کرایا جہاں وہ آرام وسکون اور تحریر و تخلیق کے لئے عموماً جا رہتا۔ ۲۷ فروری ۱۸۸۳ء کو جوزیفین لتزماں نامی ایک عورت کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام لوسیاں (Lucien) رکھا گیا۔ گو سرکاری اندراج میں باپ کے نام کے خانے میں "نامعلوم" لکھا گیا تھا لیکن غالب خیال یہی تھا کہ اس کا باپ موپاساں ہی تھا۔ بعد ازاں ۱۸۸۴ء اور ۱۸۸۸ء میں اسی عورت کے ہاں دو مزید بچیاں پیدا ہوئیں۔ یہ تو سب جانتے تھے کہ موپاساں اس عورت کی مالی امداد کرتا تھا لیکن ان دونوں میں کیا مراسم تھے یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ لیکن یہ موپاساں ہی تھا جس نے ایک بحث کے دوران اپنے باپ سے کہا تھا، "انسانی اور خدائی قوانین میں سب سے ارفع قانون اپنی اولاد سے پیار کرنا ہے۔"

۱۸۸۴ء میں اس کی بیماری نے شدت اختیار کر لی اور وہ اپنا زیادہ تر وقت پرفضا مقامات پر گزارنے لگا۔ اب اس کے افسانوں کے تین مجموعے چھپ چکے تھے، "چاندنی" (Clair de Lune) "مس ہیریٹ" (Miss Harriet) اور "روندولی سسٹرز" (Les Soeurs Rondoli)۔

۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۰ء تک

ٹھیک ایک سال بعد موپاساں کے افسانوں کے تین مزید مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ ''موسیو پاراں'' (Monsieur Parent) ''دن رات کی کہانیاں'' (Les contes du jour et de la nuit) اور ''ایویط'' (Yvette)۔ ۱۸۸۵ء میں ہی اس کا مشہور عالم شاہکار ناول ''دوست'' (Bel-Ami) چھپا۔ یہ ایک عیّار، لالچی اور مفاد پرست نوجوان کی کہانی ہے جو صرف اپنی شکل وصورت اور ظاہری وضع قطع کے سہارے کامیابی کے زینے طے کرتا جاتا ہے۔ اس شاہکار میں موپاساں کے ہاں مطلب پرست، شہرت اور دولت کے بھوکے سیاستدانوں، سرکاری اہلکاروں، اخبار نویسوں اور سماجی حیثیت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر ڈالنے پر تیار خواتین کی تصویر کشی میں ایسی ہی مہارت اور چابکدستی دکھائی دیتی ہے جیسے اجڈ اور گنوار دیہاتی کسانوں کی۔

اسی سال وہ اٹلی اور سیسلی کے سفر پر نکلا۔ اس کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ چکا تھا اور اب اس کا زیادہ وقت پیرس کے نامی گرامی لکھاریوں کی صحبت میں گزرتا۔ ''ایک زندگی'' اور اس کے بعد ''دوست'' کی بے پناہ کامیابی نے اسے پیرس کی محفلوں میں انتہائی مقبول بنا دیا تھا۔ اس کے دروازے پر دعوت ناموں کے ڈھیر لگے رہتے۔ پال موراں (Paul Morand) لکھتا ہے، ''عورتیں اس کی متلاشی رہتی ہیں، وہ اس کو پوجتی ہیں، وہ اس کے ارد گرد یوں منڈلاتی ہیں جیسے کامیابی کی سرانڈ کے گرد مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔'' ۱۸۸۶ء میں ''ہورلا'' (Horla) اپنی پہلی شکل میں چھپا۔ اس خوفناک کہانی کو پڑھتے ہوئے بادی النظر میں احساس ہوتا ہے کہ اس دور میں موپاساں کی جسمانی بیماری اس کی نفسیاتی صلاحیتوں پر خفقان کی صورت میں اثرانداز ہونے لگی تھی۔ اس کی کہانیوں میں نمودار ہونے والے کرداروں کی دیوانگی اور وحشت کے ابتدائی حوالے اس کی اسی بیماری میں پائے جاتے ہیں۔

۱۸۸۷ء میں اس نے ہورلا کی دوسری ترتیب اور ''مونت اوریول'' (Mont-Oriol) نامی ناول پیش کیا۔ ۱۸۸۸ء میں ایک ناول ''پیئر اور ژاں'' (Pierre et Jean)، ایک مجموعہ ''مادام ہوسوں کا گلاب'' (Le Rosier de Madame Housson) اور ایک سفرنامہ ''لہروں کے دوش پر'' (Sur L'eau) منظرِ عام پر آئے۔ ۱۸۸۹ء میں اس کا

بھائی ایروؔے جسے دماغی امراض کی بنا پر پاگل خانے میں ڈال دیا گیا تھا اسی دیوانگی کے عالم میں اس جہاں سے چل دیا۔ اسی سال موپاساںؔ نے ایک ناول ''موت کا راج'' (Fort comme le mort) لکھا۔ ۱۸۹۰ء میں اس کا آخری ناول ''ہمارا دل'' (Notre Coeur) چھپا۔

ماں کی دیکھ بھال، بھائی کے علاج معالجے اور اس کی موت کے بعد اس کی بیوہ اور اپنی اولاد کے اخراجات کے باوجود اپنی تحریروں کی آمدن کے باعث موپاساںؔ قدرے پر آسائش زندگی گزارتا رہا۔ درحقیقت ۱۸۸۱ء اور ۱۸۹۱ء کے دوران موپاساںؔ نے قریباً اڑھائی سو کہانیاں، سات ناول، تین سفر نامے، ایک منظوم دیوان، چند ڈرامائی تماثیل اور تین سو اخباری مضامین لکھے۔

۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء کے درمیانی عرصے میں موپاساںؔ کی بیماری شدّت اختیار کر گئی۔ اعصابی درد، کمزور بینائی اور فالج روز بروز پھیلتا ہی جاتا تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۹۱ء کو وہ لکھتا ہے، ''موت دستک دے رہی ہے اور میں پاگل ہو رہا ہوں۔'' یکم اور دو جنوری ۱۸۹۲ء کی درمیانی رات خودکشی کی ناکام کوشش اسے پاسیؔ (Passy) میں ڈاکٹر بلانشؔ کے کلینک میں لا پھینکتی ہے۔ ٦ جولائی ۱۸۹۳ء کو فرانسیسی ادب کا روشن مینار اور بلا مبالغہ دنیا کے عظیم ترین افسانہ نگاروں میں ایک، اندھے پن، فالج اور دیوانگی کی حالت میں اس دنیا کو الوداع کہہ گیا۔ اسے موپارناسؔ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

اس کے کاغذات میں ''L'Ame Etrangere'' اور ''L'Agnelus'' نامی دو ناولوں کے ابتدائی ابواب دستیاب ہوئے۔ یہ دونوں نامکمل ناول ''La paix de menage'' نامی دو ایکٹ کا ایک ڈرامہ، ''Le Colporteur'' اور ''Le Pere Milon'' نامی کہانیوں کے دو مجموعے اس کی وفات کے بعد چھپے۔ خطوط کا ایک مجموعہ بھی ''Amitie amoureuse'' کے عنوان سے سامنے آیا جس کا انتساب اس نے اپنی ماں کے نام کیا تھا لیکن غالب قیاس ہے کہ یہ شائد مستند نہیں ہے۔

مترجم

---

(۱) باکالوریّا (Baccalaureat): فرانسیسی نظام تعلیم کے تحت وہ امتحان جو سترہ اٹھارہ سال کے طالب علم سکول چھوڑتے ہوئے دیتے ہیں۔ برطانوی نظام تعلیم کے مطابق یہ گریجویشن کے برابر ہوتا ہے۔

گی دموپاساں

Guy de Maupassant

ایک تنقیدی مطالعہ

''کتنی مختصر۔۔۔ کتنی لمبی۔۔۔زندگی کبھی کبھار کتنی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔''
''میں اکیلا ہوں۔۔۔سچ مچ اکیلا۔۔۔سچ مچ آزاد۔''

گی دموپاساں

ادب کی تاریخ میں گی دموپاساں بننے سے پہلے، فرانس یا غالباً دنیا کے عظیم ترین افسانہ نویس نے مختصر عرصے کے لئے تین قلمی نام اختیار کئے۔ یہ تین نام جوزف پرونئیر (Joseph Prunier) گی دوالمونٹ (Guy de Valmont) اور موفرینیوز (Maufrigneuse) تھے۔ یہ تین قلمی نام موپاساں کی اصلی شخصیت کو بیک وقت پنہاں اور آشکارہ کرتے ہیں۔

اپنی ابتدائی کہانیوں میں سے ایک کے کردار جوزف پرونئیر کی مانند موپاساں بھی ظاہری اور باطنی طور پر ایک مکمل نارمن تھا۔ گی دوالمونٹ کے نام کے پیچھے موپاساں کی محبوب ترین کتابوں میں سے ایک ''موسیو دکامور'' کا کردار 'موسیو دوالمونٹ' اور کلودرلوس دلا کلوس (Chloderlos de Laclos) کی مشہور کاوش Liaisons Dangereuses کا پراسرار کردار والمونٹ پائے جاتے ہیں۔ موفرینیوز نامی کردار دراصل بالزاق کی تحریر Cabinets des antiques کی ہیروئین ہے۔ یہ آخری قلمی نام جو موپاساں نے

قریباً اسّی سے زیادہ کہانیوں میں اختیار کیا شراب و شباب اور مسرت و انبساط کی اس دنیا کی علامت ہے جسے موپاساںؔ نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ یوں ان تین ناموں کے پس منظر میں موپاساںؔ اپنی نارمن جنم بھومی، زندگی کی رنگینیوں اور پیار و محبت کی دنیا کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ یہی تین اوصاف ہیں جو موپاساںؔ کے اندازِ تحریر میں جھلکتے ہیں۔ فطری طور پر مضبوط شخصیت کا مالک، زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہونے والا موپاساںؔ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ حصول لذّت اور کمال فن کی نظر کر دیا۔ موپاساںؔ ہوزے ماریا دہریدیا (Jose Maria de Heredia) کو ایک خط میں لکھتا ہے، ''میں ادب کی دنیا میں ایک شہابِ ثاقب کی طرح نمودار ہوا ہوں اور بجلی کی کڑک کی مانند روانہ ہوں جاؤں گا۔'' یوں وہ اپنی زندگی اور اپنے فن میں مماثلت پیش کرتا ہے کیونکہ خود اس کے بقول اس کا بھرپور، پراسرار، دلگداز اور حقیقی دنیا سے قریب ترین فن اس کی اپنی زندگی کا عکاس تھا۔۔۔اور آج ہم موپاساںؔ کو انہیں الفاظ سے بیان کر سکتے ہیں۔۔۔ بھرپور، پراسرار، دلگداز اور حقیقی دنیا سے قریب ترین!

اناطول فرانسؔ (Anatole France) نے موپاساںؔ کو کہانی کا شہزادہ قرار دیتے ہوئے کہا، ''اس کے کرداروں میں وہ تنوّع اور اس کے موضوعات میں وہ فراوانی ہے جو آج کے کسی کہانی نویس میں نہیں پائی جاتی۔'' زندگی کے انتہائی مخفی رخ دیکھنے اور اپنی تحریر میں مزاح سے ڈرامائی انداز، طنز سے سوز و گداز، کجروی سے شرم و حیا۔۔۔ غرضیکہ موپاساںؔ کو کہانی کے نشیب و فراز غیر معمولی لیکن تیکھے انداز میں قاری تک پہنچانے کا ملکہ حاصل تھا۔ یوں اس کے پہلے مجموعے La Maison Tellier کو اس کے مکمل کام کو سمجھنے کی کنجی سمجھا جا سکتا ہے۔ La Maison Tellier طوائفوں کی زندگی پر ایک طنز ہے جبکہ L'histoire d'une fille de ferme ایک کسان لڑکی کی دردناک داستان ہے۔ Une partie de campagne منہ زور اور سرکش محبت کا گیت ہے اور Le papa de Simon ایک ایسے یتیم لڑکے کی کہانی ہے جسے ایک منہ بولا باپ مل جاتا ہے۔ En famille میں بورژوا طبقے پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔ Sur l'eau میں انسانی خوف کا انتہائی شاندار تجزیہ کیا گیا ہے۔ Au printemps میں محبت کی ناکامی بیان کی گئی ہے جبکہ La femme de Paul جنسی بے

راوروی پر ایک بے لگام تحریر ہے۔

موپاساں کے بیشتر مجموعات میں ایسا ہی تنوع اور بیشتر کہانیوں میں ایسی ہی ترتیب پائی جاتی ہے جس کے پس منظر میں لکھاری کا وہ گہرا مشاہدہ ہے جس سے وہ ہر چیز، ہر حرکت، ہر چہرے کے پیچھے ایک ''سادہ حقیقت'' تلاش کرتا ہے۔ مالارمے (Mallarmé) نے بالکل درست لکھا تھا، ''Boule de Suif، Miss Harriett اور La Maison Tellier جیسے مکمل شاہکاروں کے لکھاری کے ہاں موضوعات کی وہ قوسِ قزح پائی جاتی ہے جو نہ صرف قاری کو اپنی مکمل گرفت میں لے لیتی ہے بلکہ قاری کو اپنے نقطۂ نگاہ سے اتفاق کرنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔''

موپاساں نے ابتدائی دنوں میں گستاف فلوبرٹ اور ایمیل زولا کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن یہ دونوں اساتذہ خود کو کچھ بھی کہیں، بنیادی طور پر یہ دونوں رومانیت کے علم بردار تھے۔ موپاساں اپنے دور کا آخری فطرت پسند یا قطعیت پسند تھا۔ موپاساں نے اس سمت میں اتنا کام کیا کہ اسے فطرت پسندی کا حرف آخر کہا جا سکتا ہے۔ اس نے کوئی ایسی چیز بیان نہیں کی جو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ چکا ہو۔ بچپن کے جانے پہچانے دیہاتی اور کسان اس کی لاتعداد کہانیوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ سرکاری دفاتر میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ "L'Heritage" میں دکھائی دیتا ہے۔ "Maroca" میں الجیریا کے سفر کے دوران کے جانے والے مشاہدات بنیاد بنتے ہیں۔ وہ صحت افزا مقامات پر چند دن گزارتا ہے اور "Mont-Oriol" لکھ ڈالتا ہے۔ وہ اخبار نویسی کرتا ہے اور "Bel-Ami" لکھ دیتا ہے۔ وہ فیشن ایبل لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے اور ایسے لوگوں سے اپنی تمام تر بیزاری کے باوجود ''موت کا راج'' اور ''ہمارا دل'' لکھ دیتا ہے۔

بنیادی طور پر وہ تمام انسانوں کو یکساں سمجھتا ہے۔ ہر طبقے میں وہ ایک سی وحشیانہ، عیارانہ اور حیوانی جبلت دیکھتا ہے۔ اگرچہ موپاساں کی دنیا کوئی پر مسرّت جگہ نہیں ہے لیکن وہ اس کے سوا اور کسی دنیا سے واقف بھی تو نہیں ہے۔ بڑھاپے کا خوف، کسی بھی چیز سے لطف اندوز نہ ہو سکنے کا خوف، اور سب سے بڑھ کر موت کا خوف ساری عمر کسی آسیب کی طرح اس کے سر پر سوار رہا۔ یہ ایک انتہائی سادہ نقطہء نگاہ ہے۔ وہ نیکی اور بدی میں کوئی تمیز نہیں رکھتا۔ وہ

ایک انسان کو کسی دوسرے انسان پر ترجیح نہیں دیتا۔ وہ کبھی زندگی کے معنی تلاش نہیں کرتا۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے وہ صرف وہی کچھ بیان کرتا ہے۔ اور کچھ ایسی تفصیل اور شدت سے بیان کرتا ہے کہ اس کا شمار ادب کے عظیم ترین کا تبین میں کیا جاتا ہے۔ تحریر کے متن کی مانند موپاساں کا انداز بھی انتہائی سادہ اور پر اثر ہے۔ وہ لفاظی پر قطعی یقین نہیں رکھتا اور اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے سادہ سے سادہ پیرائے میں بیان کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ لیکن اس سادگی کے باوجود وہ ادب میں عمومی طور پر اور کہانی نویسی میں خصوصی طور پر دنیا کے عظیم ترین ناموں میں شمار ہوتا ہے۔

اس مجموعے میں شامل ایک ناولٹ اور چودہ کہانیاں موپاساں کے دو مجموعوں "Boule de Suif et Autres Contes normandes" اور "Contes du jour et de la nuit" سے لی گئی ہیں۔

موپاساں کی اپنی ذاتی زندگی کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی خواہش اب کبھی پوری نہ ہو گی۔

شوکت نواز خان نیازی

اسلام آباد

۳۰ جنوری ۲۰۰۶ء

2

خدا حافظ

Adieu

دونوں دوست کھانے سے فراغت کے بعد ریستوراں کی کھڑکی سے باہر سڑک پر گہما گہمی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ موسمِ سرما کی شاموں میں پیرس کی گلیوں میں آوارہ پھرنے والے ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو سے چہل قدمی کرنے والوں کا جی پر لگا کر کہیں اڑ جانے کو چاہتا تھا۔ کہیں دور، نجانے کہاں۔ اور دریاؤں کی لہروں پر کھیلتی ہوئی چاندنی، ستاروں کی مانند جھلملاتے ہوئے جگنوؤں اور بلبل کے گیتوں والے خوابوں کے دیس میں کھو جاتے تھے۔

پہلے دوست، ہنری سیموں، نے ایک گہری سانس بھری اور بولا، ''آہ! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کیسی اداس بات ہے۔ کسی زمانے میں ایسی ہی شاموں میں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میرے اندر آگ بھر دی گئی ہو۔ اور آج مجھے تاسّف اور مایوسی کے علاوہ اور کچھ محسوس نہیں ہو رہا۔ زندگی بھی کیسے پلک جھپکتے میں بیت جاتی ہے!''

وہ شاید پینتالیس سال کے پیٹے میں ہو گا، قدرے بھاری لیکن ابھی سے مکمل طور پر گنجا ہو چکا تھا۔

اس کے دوست، پیئر کارنیئے نے، جو عمر میں اس سے کچھ ہی بڑا، لیکن اس سے کہیں دبلا

پتلا اور چست تھا، جواب دیا، ''میرے دوست! مجھے تو احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کب بوڑھا ہو گیا۔ میں ہمیشہ ہی سے بہت خوش مزاج، پر جوش اور چاق و چوبند ہوا کرتا تھا۔ لیکن چونکہ ہم ہر روز ہی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہیں اس لئے شائد ہمیں گزرتی ہوئی عمر کی شکست و ریخت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور ہمارے چہروں پر یوں دھیرے دھیرے اور تواتر سے نقش چھوڑتا جاتا ہے کہ ہمیں ان تبدیلیوں کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہم عمر کی ان ستم ظریفیوں کے ہاتھوں دو تین سال ہی میں مر کھپ نہیں جاتے۔ ہمیں ان کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس کے لئے تو چھ ماہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھے بغیر رہیں تو پھر درست اندازہ ہو گا۔۔۔ ہاں! پھر معلوم ہو گا! اور عورتیں! میرے دوست، مجھے ان بیچاریوں پر تو ترس آتا ہے۔ ان کی ساری خوشی، ساری طاقت اور ان کی ساری زندگی ان کے حسن میں ہی پنہاں ہے جو صرف پانچ چھ سال تک قائم رہتا ہے۔

مجھے تو اپنے بڑھاپے کا احساس ہی نہ ہوا۔ میں تو پچاس سال کی عمر میں بھی خود کو نوجوان سمجھتا تھا۔ چونکہ مجھے کوئی جسمانی کمزوری لاحق نہ تھی اس لئے میں خوش باش اور پر سکون زندگی گزار رہا تھا۔

اپنی جوانی کے زوال کا انکشاف مجھ پر یوں ہی ایک روز اس خوفناک لیکن قطعی غیر محسوس انداز میں ہوا کہ میں چھ ماہ تک بستر سے نہ اٹھ سکا۔۔۔ لیکن۔۔۔ پھر میں نے اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔

سب مردوں کی طرح مجھے بھی بہت سی عورتیں دل کو بھائی تھیں، لیکن محبت صرف ایک ہی سے ہوئی تھی۔

بارہ سال ہو گئے، جنگ کے کچھ عرصے بعد وہ مجھے پہلی مرتبہ عطریتاہ کے ساحلی شہر میں ملی تھی۔ صبح کے وقت اس ساحل سے زیادہ پر سکون جگہ اور کوئی نہ تھی۔

ساحل گھوڑے کی نعل کی شکل کا تھا جس کی تین اطراف میں اونچی بلند و بالا سفید کھڑی چٹانیں تھیں جن میں چیچک کے داغوں کی مانند چھوٹے چھوٹے غار دکھائی دیتے تھے۔ یہیں سے گول چمکدار پتھروں والی ایک چوڑی پٹی سمندر میں دور تک چلی جاتی تھی۔ اور اسی پٹی پر دھوپ سے روشن دنوں میں دور دور سے علاقے کی مکین اور سیاح خواتین سمندر میں نہانے آتی

تھیں۔ اس وقت یوں دکھائی دیتا تھا کہ جیسے سمندر کے بیچوں بیچ رنگدار پھولوں کا ایک باغ اگ آیا ہو۔ لوگ سمندر کے کنارے جا بیٹھتے اور نہانے والیوں کو دیکھتے۔ پیرا کی کے لباس کے اوپر فلالین کے گاؤن اوڑھے ہوئے وہ دھیرے دھیرے پانی میں اترتیں اور جب لہروں کی جھاگ گھٹنوں تک آن پہنچتی تو اپنا گاؤن اتار پھینکتیں اور تیز قدموں سے سمندر میں کود جاتیں۔ انہی چند قدموں میں پانی کی ٹھنڈک کی وجہ سے کپکپاہٹ طاری ہو جاتی اور چند لمحوں کیلئے سانس رک سا جاتا۔ سمندر میں نہانا بھی ایک امتحان ہوتا ہے۔ یہیں کسی عورت کے اصلی خدوخال کا اندازہ ہوتا ہے۔ ٹخنوں سے لیکر گلے تک۔ خصوصاً پانی سے باہر نکلتے ہوئے تو سب خامیاں سامنے آجاتی ہیں حالانکہ ٹھنڈا پانی تو یوں بھی ڈھیلے ڈھالے عمر رسیدہ گوشت کو کھینچ تان کر کس دیتا ہے۔

پہلی مرتبہ میری اس لڑکی پر نظر پڑی تو میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ وہ کسی جل پری کی مانند پانی سے نکل رہی تھی۔ کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کے دل و دماغ پر جادو کر دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ زندگی کا واحد مقصد ہی صرف اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہونا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی میں بھی اسی سحر میں گرفتار ہو گیا تھا۔

ہمارا تعارف کرایا گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس لڑکی سے اتنا پیار کرتا ہوں جتنا میں نے ساری زندگی میں کسی سے نہ کیا ہو گا۔ میرا دل ہر وقت اس ہی کی چاہ میں کڑھتا رہتا۔ کوئی لڑکی یوں آپ کے حواس پر سوار ہو جائے اس سے زیادہ اذیت ناک اور پر مسرت چیز اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ بیک وقت انبساط اور عذاب کی انتہا ہوتی ہے۔ اس کی نگاہیں۔۔۔ اس کی مسکراہٹ۔۔۔ ہوا میں بکھری اس کی زلفیں۔۔۔ اس کی چہرے کے نشیب و فراز۔۔۔ اس کی پلکوں کی ہلکی سی جنبش بھی میرے دل و دماغ میں طوفان برپا کر دیتی۔ اس کی ساری ہستی میرے اعصاب پر قابو پا چکی تھی، اس کی حرکات و سکنات، اس کا اٹھنا بیٹھنا، حتیٰ کہ اس کا لباس بھی اس کے بدن پر پہلے سے کہیں زیادہ حسین دکھائی دیتا تھا۔ کسی جگہ اس کا سکارف پڑا ہوا دکھائی دیتا یا اس کا دستانہ کسی کرسی پر پھینکا ہوا نظر آتا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ اور اس جیسے نفیس ہیٹ تو سارے شہر میں کسی کے پاس نہ تھے۔

وہ شادی شدہ تھی۔ اس کا شوہر ہر ہفتے کے روز اس سے ملنے آتا اور سوموار کو واپس چلا

جاتا۔ یوں بھی مجھے اس کی کوئی پرواہ نہ تھی اور نہ ہی میں اس سے حسد کرتا تھا۔ میرے لئے میری ساری زندگی میں اس سے زیادہ غیر اہم شخص کوئی نہ ہوگا اور نہ ہی اس شخص سے کم توجہ میں نے کسی اور کو دی ہو گی۔

لیکن اس لڑکی کو! آہ، اس لڑکی کو میں نے کیسے ٹوٹ کر چاہا۔ وہ بھی تو کتنی حسین، پر وقار اور نوجوان تھی۔ وہ سراپا جوانی، نفاست اور تازگی تھی۔ اس سے پہلے مجھے کبھی احساس بھی نہ ہوا تھا کہ عورت کتنی خوبصورت، نازک، سحر انگیز اور پر وقار چیز کا نام ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کسی کے رخسار کا خم بھی اس قدر دلفریب ہو سکتا ہے، کسی کے ہونٹ کی ایک جنبش، کسی کے کان کی گلابی لو اور ناک جیسے مضحکہ خیز عضو میں بھی اتنا جادو ہو سکتا ہے۔

تین ماہ یوں ہی گزر گئے اور میں حسرت و یاس سے بھاری دل کے ساتھ امریکہ چلا آیا۔ لیکن اس کی شبیہہ میرے دل میں کندہ رہی، فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہوئی۔ میں اس سے جتنا دور ہوا میرے دل پر اس کی محبت کا شکنجہ اور مضبوط ہوتا گیا۔ سالہا سال گزر گئے۔ لیکن میں اس کو بھول نہ سکا۔ اس کا حسین اور معصوم چہرہ میرے دل کے اندر اور میری نگاہوں کے سامنے رہتا۔ میری محبت اور میری وفا میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ لیکن میری محبت اب ایک پر سکون اور خاموش روپ دھار چکی تھی۔ اپنی پوری زندگی میں سب سے خوبصورت اور دلفریب چیز کی یادوں کا روپ۔

کسی مرد کی زندگی میں بارہ سال پلک جھپکتے ہی گزر جاتے ہیں۔ سال گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ایک کے بعد دوسرا سال، کبھی تیزی سے کبھی دھیرے سے، کبھی سکون سے اور کبھی شور شرابے میں، ہر سال کتنا لمبا ہوتا ہے اور کیسے پلک جھپکتے ہی ختم بھی ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے پیچھے سال اتنی جلدی اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور کوئی نقش چھوڑے بغیر یوں مکمل طور پر غائب ہو جاتے ہیں کہ اگر پیچھے پڑ کر گزرے ہوئے سالوں پر ایک نظر ڈالیں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا اور کچھ سمجھ نہیں آتا کہ ہم یکدم اتنے بوڑھے کیسے ہو گئے۔ مجھے بھی یوں ہی لگتا ہے کہ آج اور ان دنوں میں جو میں نے عطریتاہ کے ساحل پر گزارے تھے صرف چند مہینوں کا ہی فرق ہو گا۔

ابھی گزشتہ بہار ہی کی بات ہے کہ میں اپنے دوستوں کے ہاں میزاں لافیط میں ایک دعوت پر مدعو تھا۔ جیسے ہی ٹرین روانہ ہوئی ایک بھاری بھر کم عورت اور اس کے پیچھے پیچھے چار کم سن بچیاں میری بوگی میں داخل ہوئیں۔ میں نے اس عورت پر، جو ایک مرغی کی طرح اپنے چوزوں کو سنبھالے ہوئے تھی، ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ اس کے چاند جیسے روشن گول مٹول چہرے کے گرد اس کا سیاہ فیتوں والا ہیٹ بادلوں کی مانند ہالہ بنائے ہوئے تھا۔ تیزی سے چلنے کے باعث اس کا سانس پھول چکا تھا۔ بچیاں فوراً ہی آپس میں باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ میں نے اپنا اخبار کھولا اور مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

ٹرین آسنییَر سے گزری ہی تھی کہ مجھے اپنی لحیم شحیم ہمسفر کی آواز سنائی دی، ''معاف کیجئے جناب! کیا آپ موسیو کارنیے تو نہیں ہیں؟''

''جی ہاں محترمہ!''

اس پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں گو ایک متانت اور وقار تھا لیکن نجانے کیوں مجھے اس کی ہنسی میں حزن وملال کا شائبہ بھی دکھائی دیا۔

''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟''

میں کچھ گڑبڑا سا گیا۔ مجھے یقین تھا میں نے یہ چہرہ پہلے کہیں دیکھا ہوا ہے۔ لیکن کہاں؟ کب؟ میں نے جواب دیا، ''ج ۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔ اور نہیں بھی ۔۔۔ میں آپ کو یقیناً جانتا ہوں لیکن معاف کیجئے آپ کا نام ذہن سے اتر رہا ہے۔''

اس کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔

''مادام جولی لفاور!''

میری چھاتی میں تو جیسے کسی نے چھرا گھونپ دیا۔ ایک لمحے کیلئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ساری کائنات ختم ہو گئی ہو۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری آنکھوں کے سامنے سے جیسے کوئی پردہ اٹھالیا گیا ہو اور اب نجانے کیسے کیسے خوفناک راز افشا ہونے کو ہیں۔

یہ وہی تھی! یہ موٹی عورت وہی تھی! اور اس دوران اس نے چار بچیاں بھی پیدا کر ڈالی تھیں۔ اور یہ چار بچیاں بھی میرے لئے اتنی ہی حیرت کا باعث تھیں جتنی ان کی ماں۔ یہ اس کا ایک حصہ تھیں۔ اور ابھی سے بڑی ہو چکی تھیں۔ زندگی میں اپنا مقام بنا رہی تھیں۔ جبکہ وہ خود

ختم ہو چکی تھی۔ وہ جو مجسّم نزاکت اور نفاست تھی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ابھی کل ہی تو اس سے ملاقات ہوئی تھی اور آج مجھے وہ کس حال میں ملی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے دل میں اچانک رنج والم کا ایک طوفان اٹھا۔ قدرت کی اس ستم ظریفی کے خلاف زور زور سے چیخنے کو جی چاہا۔ اتنی حسین چیز کی تباہی اور بربادی کے خلاف غم وغصّے کا لاوا سا اُگلنے لگا۔

لیکن بظاہر میں سکتے کے عالم میں اس کو تکتا رہا۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ مجھے اپنی آنکھوں آنسوؤ بھر آتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں آنسوؤ بہار ہا تھا اس کی گم شدہ جوانی پر اور اس کی موت پر۔۔۔ ہاں جسے میں چاہتا تھا وہ مر ہی تو چکی تھی کیونکہ چار بچوں کی یہ موٹی ماں تو میرے لئے اجنبی تھی۔

میں شائد اپنے جذبات کو چھپا نہ پایا تھا کیونکہ وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی، ''میں بہت بدل گئی ہوں ناں؟ کیا کریں؟ ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔ دیکھیں! میں ماں بن گئی ہوں۔۔۔ بس ایک اچھی ماں۔۔۔ باقی سب کچھ ختم ہو گیا۔۔۔ میں سوچتی تھی کہ اگر کبھی ہم دوبارہ ملے تو آپ یقیناً مجھے نہ پہچان پائیں گے۔ آپ بھی تو بہت بدل چکے ہیں۔ میں بھی کافی دیر سوچتی رہی کہ کہیں مجھے کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔ آپ کے بال بھی بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ ذرا سوچیں! بارہ سال ہو گئے ہیں۔ بارہ سال! میری بڑی بیٹی دس سال کی ہو گئی ہے۔''

میں نے اس کی بڑی بیٹی کو دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر بھی اس کی ماں کے حسن کا ایک شائبہ دکھائی دیا۔ لیکن کچھ نا مکمل۔۔۔ آنے والے دنوں کا ایک موہوم سا احساس۔۔۔ مجھے زندگی بھی کسی ٹرین کی مانند تیزی سے گزرتی ہوئی دکھائی دی۔

میزاں لافیت کا سٹیشن آ گیا۔ میں نے اپنی محبوبہ کے ہاتھ پر ایک بوسہ ثبت کیا۔ میرے پاس اسے کہنے کو کوئی الفاظ نہ تھے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میری زبان جیسے پتھریلی ہو چکی تھی۔

شام کو اپنے گھر میں، اکیلا، میں نجانے کتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑا رہا۔ بہت دیر۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں کیسا ہوا کرتا تھا، پھر میرے ذہن میں اپنی جوانی کی شبیہہ ابھری، بھوری مونچھیں، سیاہ بال اور میرے چہرے پر نوجوانی کے تاثرات۔ لیکن اب میں بوڑھا ہو چکا تھا۔ خدا حافظ!''

3

لے پا لک

Aux champs

سمندر کے کنارے واقع گاؤں سے کچھ ہی دور پہاڑی کے دامن میں ایک جیسے دو کچے مکان ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ دونوں گھروں کے مالک کسان اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کے لئے اپنی اپنی بنجر زمین میں شب و روز مشقت کیا کرتے تھے۔ دونوں گھرانوں میں چار بچے تھے اور آٹھوں بچے صبح پو پھٹنے سے لیکر شام ڈھلے تک دونوں گھروں کے بیچ مٹی میں کھیلا کرتے تھے۔ دونوں بڑے بچوں کی عمر آٹھ برس تھی اور سب سے چھوٹے بچوں کی عمر قریباً سوا سال۔ دونوں کسانوں کی شادیاں اور پھر بچوں کی پیدائش بھی قریب قریب یک وقت ہی ہوئی تھیں۔ دونوں مائیں اپنے اپنے بچوں کو بمشکل پہچان پاتی تھیں جبکہ دونوں باپ تو عموماً دھوکہ کھا جاتے تھے۔ ان کے دماغ میں آٹھ نام چکراتے رہتے اور وہ ہمیشہ نام گڈمڈ کر دیتے۔ کسی ایک کو بلانے کی خاطر تین چار نام پکارنے کے بعد ہی وہ درست نام پکار پاتے۔

رولپورؔغ کی جانب سے آتے ہوئے پہلا گھر طوواشؔ کا تھا جس کی ایک بیٹی اور تین بیٹے تھے۔ دوسرے گھر میں والیںؔ کا خاندان بستا تھا جو تین بیٹیوں اور ایک بیٹے پر مشتمل تھا۔ یہ دونوں خاندان صرف یخنی، آلو اور تازہ ہوا پر زندہ تھے۔ صبح سات بجے، بارہ بجے دوپہر اور پھر شام چھ بجے دونوں گھر والیاں اپنے اپنے بچوں کو کھانے کے لئے یوں اکٹھا کرتی تھیں جیسے

چرواہا اپنے ریوڑ کو اکٹھا کرتا ہے۔ تمام بچے عمر کے اعتبار سے لمبی میز کے سامنے بیٹھ جاتے جو سالہا سال کے استعمال کے بعد چمکنے لگی تھی۔ سب سے چھوٹے بچے کا چہرہ بمشکل میز کی سطح سے اوپر دکھائی دیتا تھا۔ جس پانی میں آلو ابالے گئے تھے اس پانی میں بھیگی ہوئی روٹی، آدھی گوبھی اور تین پیاز۔ سارا خاندان پیٹ بھر کر کھاتا۔ ماں میز کے کونے پر بیٹھی سب سے چھوٹے بچے کو کھلاتی۔

اتوار کے دن دعوت اڑائی جاتی اور گوشت کی چند بوٹیاں بھی بھونی جاتیں۔ اس روز باپ میز پر دیر تک بیٹھا رہتا اور زیرِ لب بڑبڑاتا رہتا، ''کاش روز ہی ایسا کھانا ہوتا۔''

اگست کے مہینے میں ایک دوپہر اچانک ایک بگھی دونوں گھروں کے سامنے آن رکی۔ بگھی کی باگیں ایک نوجوان خاتون نے تھام رکھی تھیں۔ خاتون نے ساتھ اپنے بیٹھے ہوئے مرد سے کہا، ''اوہ ہنری! ذرا ان بچوں کو دیکھو تو۔ مٹی میں کھیلتے ہوئے کیسے پیارے لگ رہے ہیں۔''

مرد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ داد و تحسین کے ان الفاظ کا عادی ہو چکا تھا اور کبھی کبھار تو ایسے الفاظ اس کے دل میں ندامت اور ملامت کے چرکے لگا جاتے۔ عورت پھر بولی، ''میں ان کو پیار کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہائے کاش میرا بھی ایسا ہی ایک بچہ ہوتا۔۔۔ بالکل اُس چھوٹے بچے جیسا۔۔۔''

پھر یکایک وہ کود کر گھوڑا گاڑی سے نیچے اتری اور بھاگ کر ان بچوں کے پاس جا پہنچی۔ دونوں چھوٹے بچوں میں سے ایک کو، جو طوواش کا بچہ تھا، اٹھا کر اس کے میلے کچیلے گالوں، مٹی سے اٹے ہوئے بالوں اور اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو دیوانہ وار چومنے لگی۔ دوسری جانب بچہ خود کو اس ناگہانی یلغار سے بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

پھر وہ اپنی گھوڑا گاڑی پر سوار ہوئی اور سرپٹ بھگاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اگلے ہفتے وہ پھر آئی۔ آتے ہی بچوں کے ساتھ زمین پر ہی آلتی پالتی مارے بیٹھ گئی اور اسی بچے کو اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اس کے منہ میں انواع و اقسام کی کیک پیسٹریاں بھرنے لگی۔ دوسرے بچوں کو بھی مٹھائیاں ملیں اور وہ دیر تک کسی کم سن بچی کی مانند مٹی میں ان سب کے ساتھ کھیلتی رہی اور اس دوران اس کا شوہر خاموشی اور تحمل سے گھوڑا گاڑی میں اس کا انتظار

کرتا رہا۔ اگلی مرتبہ وہ آئی اور بچے کے والدین سے ملی۔ اب وہ تقریباً روزانہ ہی آنے لگی تھی۔ ہر روز اس کی ٹوکریاں پھل مٹھائیوں اور جیبیں سکّوں سے بھری ہوتیں۔ اس کا نام مادام ہنری دوُ بیئنغ تھا۔

پھر ایک دن وہ آئی تو اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ نیچے اترا اور بچوں کو ملے بغیر دونوں کسان کے گھر میں داخل ہو گئے۔ کسان اور اسکی بیوی لکڑیاں چیرنے میں مصروف تھے۔ مہمانوں کو دیکھ کے وہ چونک اٹھے۔ فوراً کرسیاں کھینچ کر سامنے رکھیں۔ پھر مؤدبانہ اور متوقع نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگے۔

مادام ہنری دوُ بیئنغ نے لڑکھڑاتی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ''میں آج آپ سے اس لئے ملنے آئی ہوں کہ۔۔۔ میں چاہتی ہوں۔۔۔ میں اپنے ساتھ آپ کا۔۔۔ چھوٹا بیٹا لیجانا چاہتی ہوں۔''

کسان اور اس کی بیوی دونوں بدحواسی کے عالم میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکتے رہے۔

مادام دوُ بیئنغ نے ایک سانس بھری اور پھر بولیں، ''ہماری کوئی اولاد نہیں ہے۔ میں اور میرا شوہر ہم بالکل اکیلے ہیں۔۔۔ ہم آپ کے بیٹے کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔۔۔ کیا آپ کو منظور ہے؟''

کسان کی بیوی کو بالآخر بات سمجھ میں آ گئی۔ وہ بولی، ''کیا آپ ہمارے ننھے شارلو کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں؟ نہیں۔۔۔ بالکل نہیں!''

مسٹر دوُ بیئنغ نے مداخلت کی اور دھیمے لہجے میں کہنے لگا ''میری بیوی شائد درست طریقے سے اپنا مقصد بیان نہیں کر پائی۔ ہم اس کو گود لینا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کو ملنے آتا رہے گا۔ اگر وہ بڑا ہو کر شریف نوجوان بنا، جس کا ہمیں پورا یقین ہے، تو وہ ہماری جائداد کا قانونی وارث ہو گا۔ اگر بالفرض اس دوران ہماری کوئی اور اولاد ہو گئی تو بھی اس کو اس کا پورا قانونی حق ملے گا۔ لیکن اگر وہ ہماری توقعات پر پورا نہ اترا تو سن بلوغت کو پہنچتے ہی اس کو بیس ہزار فرانک مل جائیں گے جو ابھی اس کے نام پر ایک وکیل کے ہاں جمع کرا دیئے جائیں گے۔ ہمیں اپنی اولاد سے آپ کی جدائی کا بھی احساس ہے اس لئے ہم آپ کو تاحیات ایک سو فرانک ماہانہ وظیفہ پیش کریں گے۔ کیا آپ میری بات سمجھ رہے ہیں؟''

کسان کی بیوی غصے سے لال پیلی ہوتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے شارلو کو بیچ ڈالیں؟ ایک ماں سے ایسی بات کر رہے ہیں؟ نہیں! کبھی نہیں! توبہ توبہ! کیسی گھناؤنی بات ہے!''

کسان جو معاملے پر سنجیدگی سے غور کرتا رہا، منہ سے کچھ نہ بولا لیکن اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنی بیوی کے فیصلے کی تائید کرتا رہا۔

مادام دوبیئنغ ناامیدی کے عالم میں فرطِ جذبات سے رونے لگی۔ اپنے شوہر کی جانب مڑتے ہوئے، آنسوؤں سے بھرائی ہوئی آواز میں کسی ایسے بچے کے مانند جسے ہمیشہ اپنی ہر خواہش پوری ہونے کی عادت ہو وہ بولی، ''ہنری! نہیں دیتے! یہ بچہ نہیں دیتے!''

اس کے شوہر نے ایک آخری کوشش کی، ''دیکھیں خاتون! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ذرا اس بچے کے مستقبل کے بارے میں تو بھی سوچیں۔۔۔اس کی خوشیاں۔۔۔''

کسان کی بیوی کے فوراً اس کی بات کاٹی، ''بس! ہم نے سوچ لیا اور ہم نے سمجھ لیا! اب آپ یہاں سے چلے جائیں اور دوبارہ یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کسی کا بچہ یوں ہی لے جائیں گے آپ؟''

باہر آتے ہوئے مادام دوبیئنغ کے دماغ میں اچانک ایک کوندا سا لپکا۔ اس نے ایک ہی عمر کے دو بچے دیکھے تھے۔ انہوں نے آنسو پوچھتے ہوئے ایک ضدی بچے کی سی ڈھٹائی سے پوچھا، ''لیکن وہ دوسرا چھوٹا بچہ تو آپ کا نہیں ہے؟''

طوواش بولا، ''نہیں۔ وہ ہمسائیوں کا بچہ ہے۔ آپ چاہیں تو ان سے پوچھ سکتی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ واپس اپنے گھر میں چلا گیا جہاں سے اس کی بیوی کے چلانے کی آواز بدستور آرہی تھی۔

والیں اپنی بیوی کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ دونوں روٹی کے ٹکڑوں پر انتہائی کنجوسی سے مکھن لگا کر کھا رہے تھے۔

مسٹر دوبیئنغ نے اپنا مدعا بیان کیا لیکن اس مرتبہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ گھما پھرا کر، زیادہ احتیاط سے اور زیادہ سوچ سمجھ کر۔ دونوں میاں بیوی پہلے تو انکار میں سر ہلانے لگے

لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ سو فرانک ماہانہ وظیفہ ادا کیا جائے گا، انہوں نے مضطربانہ انداز میں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے اشارے بازی کرنا شروع کیا۔ دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کسان کی بیوی بولی، ''اب تم ہی کچھ کہو!''

کسان بوجھل لہجے میں بولا، ''کوئی ایسا گناہ بھی نہیں ہے۔''

مادام دوٗبیئنغ نے دھڑکتے دل کے ساتھ امید کی ایک کرن دیکھتے ہوئے بچے کے مستقبل اس کی خوشیوں اور اس دولت کا ذکر کیا جو وہ جوان ہو کر اپنے ماں باپ کو لا کر دے سکتا ہے۔

کسان نے پوچھا، ''اور یہ سو فرانک ماہانہ کے وظیفہ کا اقرار نامہ وکیل کے سامنے کیا جائے گا؟''

مسٹر دوٗبیئنغ نے یقین دہانی کرائی، ''جی ہاں۔ کل صبح ہی۔''

چند لمحے سوچنے کے بعد والیئس کی بیوی بولی، ''دیکھیں اس بچے کو ہم سے جدا کرنے کے لئے سو فرانک کم ہیں۔ ابھی چند سالوں میں ہی وہ ہمارے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اگر آپ ایک سو بیس فرانک۔۔۔''

مادام دوٗبیئنغ جو بے چینی سے میز کے نیچے اپنا پیر پٹخ رہی تھیں، پلک جھپکتے ہی راضی ہو گئیں۔ چونکہ وہ بچہ ابھی اسی وقت اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں اس لئے انہوں نے ایک سو فرانک تحفتاً دے دیئے جبکہ ان کا شوہر کاغذات کی تیاری میں مصروف رہا۔ گاؤں کے میئر اور ایک ہمسائے نے بطور گواہان معاہدے پر دستخط کئے۔ چند لمحوں کے بعد مادام دوٗبیئنغ دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ چلاّتے ہوئے بچے کو گود میں لئے یوں نکلیں جیسے کوئی دکان سے پسندیدہ چیز خرید کر نکلتا ہے۔

طوواشؔ اپنی بیوی کے ہمراہ اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ خاموش سپاٹ چہرے کے ساتھ، جس پر ایک لمحے کے لئے شائد تاسّف کا کوئی سایہ سا گزرا تھا۔

اس کے بعد ننھے ژاں والیئس کے بارے میں کچھ سنا نہیں گیا۔ اس کے والدین ہر ماہ کی ایک مقررہ تاریخ کو وکیل سے ایک سو بیس فرانک وصول کرلاتے تھے۔ لیکن اب ان کا اپنے ہمسائیوں کے ساتھ تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ طوواشؔ کی بیوی ہر وقت انہیں طعنے دیتی رہتی

تھی۔ گھر گھر جا کر لوگوں کو کہتی کہ اپنا بیٹا کسی کو بیچ ڈالنا کسی انسان کا کام تو نہیں ہو سکتا۔ اور کہ یہ ایک کریہہ، غلیظ اور ناپاک حرکت تھی۔ کبھی کبھار وہ دکھاوے کے لئے اپنے بیٹے کو بانہوں میں اٹھا کر زور زور سے بولتی، جیسے بچے کو سب کچھ سمجھ آرہا ہو، ''میں نے تو تمہیں نہیں بیچا! نہیں بیچا! میں اپنے بچوں کو تو نہیں بیچتی۔ میں غریب تو ہوں لیکن اپنے بچوں کو نہیں بیچتی۔'' پھر سالہا سال تک روزانہ ایسا ہی ہوتا رہا۔ اپنے گھر کے سامنے کھڑی ہو کر وہ یونہی لعن طعن کرتی تا کہ ہمسائیوں تک آواز جا سکے۔ اب طوواش کی بیوی کو احساسِ برتری ہو چکا تھا کہ اس نے اپنا بیٹا بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر اس کے بارے میں کہا جانے لگا، ''ہاں بھئی! بڑی ہمت کی بات ہے۔ اس نے ایک اچھی ماں ہونے کا ثبوت دیا ہے۔'' لوگ اس کی مثالیں دینے لگے۔ شارلو بھی، جو اب اٹھارہ سال کا ہونے کو تھا، خود کو دوسروں سے ارفع سمجھنے لگا تھا کیوں کہ اس کی ماں نے اس کو بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔

دوسری جانب وظیفے کے باعث والیں خاندان کی گزر بسر قدرے سکون سے ہونے لگی۔ طوواش خاندان کے غیض و غضب کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ حسبِ سابق تنگدستی اور افلاس کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان کا بڑا بیٹا فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور منجھلا چند ماہ بیمار رہنے کے بعد جان بحق ہو چکا تھا۔ اب شارلو ہی اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں میں دن رات مشقت کرتا اور اپنی ماں اور بہن کا پیٹ بھرتا تھا۔

وہ اکیس سال کا ہو چکا تھا کہ ایک روز ایک چمکتی ہوئی بگھی ان کے گھروں کے سامنے آ رکی۔ عمدہ لباس میں ملبوس ایک نوجوان، جس کی ایک جیب سے گھڑی کی طلائی زنجیر جھلک رہی تھی، نیچے اترا اور سفید بالوں والی ایک عمر رسیدہ عورت کو بگھی سے نیچے اترنے میں مدد دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بوڑھی عورت نے والیں کے گھر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''یہ ہے، میرے بیٹے! یہ دوسرا مکان!''۔ نوجوان نے اس بے باکی اور اعتماد سے والیں کے گھر کی دہلیز پار کی جیسے اپنے گھر میں داخل ہو رہا ہو۔ بوڑھے کسان کی بیوی کانپتے ہاتھوں سے کپڑے دھو رہی تھی اور ایک کونے میں بوڑھا کسان چولہے کے سامنے کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دونوں نے سر اٹھایا۔ نوجوان بولا، ''سلام ابا! سلام اماں!'' وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ بوڑھی عورت کے ہاتھ سے صابن چھوٹ کر گدلے پانی کے برتن میں جا گرا۔ وہ

ہکلاتے ہوئے بولی، ''ک ک۔۔۔ کیا یہ تم ہو میرے بیٹے؟ کیا یہ تم ہو میرے بیٹے؟''

نوجوان نے لپک کر اپنی بوڑھی ماں کو گلے لگالیا اور متواتر یہی الفاظ دہراتا چلا گیا، ''سلام اماں۔ سلام اماں۔'' جبکہ اس کا بوڑھا باپ اپنی پرانی پرسکون اور مطمئن آواز میں بولا، ''لوٹ آئے ہو، ژاں بیٹے!'' جیسے اس کا بیٹا چند گھنٹے بعد ہی گھر لوٹا ہو۔ جب ان کی ملاقات مکمل ہو چکی تو بوڑھے والدین فوراً اپنے بیٹے کو لوگوں سے ملوانے نکل کھڑے ہوئے۔ میئر، نائب میئر، پادری، ہیڈ ماسٹر، سبھی سے ملاقات کرائی گئی۔

اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑا ہوا شار لو یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

رات کے کھانے کے دوران وہ اپنے والدین سے بولا، ''آپ دونوں بھی کتنے احمق تھے کہ والیس کے بیٹے کو ان لوگوں کے ساتھ جانے دیا!''

اس کی ماں ہٹ دھرمی سے بولی، ''ہم اپنے بچوں کو بیچنا نہیں چاہتے تھے۔''

باپ خاموش بیٹھا رہا۔

بیٹا پھر بولا، ''میری بدقسمتی کی انتہا ہے کہ صرف آپ دونوں کی حماقت اور ضد کی وجہ سے مجھے قربانی کا بکرا بننا پڑا!''

بالآخر طوواش غصّے میں پھٹ ہی پڑا، ''کیا تم اس بات پر ناراض ہو کہ ہم نے تمہیں خود سے جدا نہیں کیا؟''

بیٹا بھی جواب میں بولا، ''نہیں! میں اس بات پر ناراض ہوں کہ آپ دونوں احمق ہیں۔ آپ جیسے ماں باپ تو اولاد کے لئے بدبختی کا باعث ہوتے ہیں۔ آپ تو اس قابل ہیں کہ میں آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ جاؤں۔''

بے یقینی کے عالم میں اس کی ماں کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیالے سے یخنی کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ ہچکیاں لینے لگی۔ یخنی کے چند گھونٹ میز پر جا گرے۔ ''اور ایک ہم ہیں کہ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر ان کی پرورش کرتے رہے۔''

نوجوان درشتی سے بولا، ''میں جس حال میں ہوں اس سے تو بہتر تھا کہ میں مر ہی جاتا۔ میں نے جب اس کو دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے سوچا، 'میں بھی تو اس کی جگہ پر ہو سکتا تھا'۔'' پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''بس اب میں مزید یہاں نہیں رہ سکتا۔ بہتر یہی ہو گا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں کیونکہ اب میں اپنی بد قسمتی کبھی نہ بھلا پاؤں گا اور آپ دونوں کی زندگی جہنم بنا دوں گا۔ لیکن یقین مانیں میں آپ دونوں کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔''

دونوں میاں بیوی خاموش آنسوؤں سے لبریز آنکھیں جھکائے بیٹھے رہے۔

وہ بولتا چلا گیا، ''نہیں۔ اب میں یہاں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اب میں اپنی قسمت کہیں اور جا کر آزماؤں گا۔''

اس نے دروازہ کھولا۔ کھلے دروازے میں سے ہمسائیوں کے ہنسنے کھلکھلانے کی آوازیں آئیں۔ والیس خاندان اپنے بیٹے کی واپسی کا جشن منا رہا تھا۔

شارلو نے دوازے کی دہلیز پر کھڑے ہوئے مڑ کر واپس ایک نظر اپنے والدین پر ڈالی، اور بولا، ''بد بخت!'' اور پھر باہر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

4

اعترافِ گناہ

La Confession d'un pere

مسٹر بادوں لمارینس کے جنازے میں جیسے سارا شہر ہی امڈ آیا تھا۔ پادری کے دعائیہ کلمات کے آخری الفاظ سے شائد کسی کو بھی اختلاف نہ تھا۔ ''مرحوم ایک انتہائی نیک شخص تھا۔''

بے شک تمام عمر، اپنے ہر قول و فعل، اپنی عادات واطوار، اپنی وضع قطع میں وہ ہمیشہ ایک انتہائی شریف انسان ثابت ہوئے تھے۔ ان کی کہی ہوئی ہر بات ہمیشہ شرافت و متانت کی مظہر ہوتی۔ ان کی دی ہوئی خیرات کے ساتھ چند الفاظ تسلّی و تشفی کے ضرور ہوتے۔ ان سے ملنے والے ہر شخص کو یہی احساس ہوتا کہ وہ اسی کے خیر خواہ ہیں۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھے۔ ان کا بیٹا کونسلر جنرل اور داماد ایک کامیاب وکیل تھا۔ دونوں اپنے اپنے پیشے میں نام کما چکے تھے اور ان کا شمار شہر کے شرفاء میں کیا جاتا تھا۔ چونکہ دونوں بیٹا بیٹی اپنے والد سے سچا پیار کرتے تھے اس لئے آج ان دونوں کی آنکھیں بھر بھر آتی تھیں۔

تجہیز و تکفین کی رسومات ختم ہوئیں تو بیٹا، بیٹی اور داماد واپس اپنے گھر لوٹے اور اپنے مرحوم باپ کے مطالعے کے کمرے میں جا بیٹھے۔ مرحوم کی ہدایات کے مطابق ان کی وصیت کے کاغذات تینوں پسماندگان صرف اسی صورت میں کھول سکتے تھے جب ان تینوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہ ہو اور مرحوم کی تدفین ہو چکی ہو۔ یہ ہدایات وصیت کے لفافے کے ساتھ

منسلک ایک کاغذ پر درج تھیں۔ مرحوم کے داماد مسٹر پورل داؤ دانڈ نے بالکل ایک وکیل کی طرح لفافہ چاک کیا اور اپنی ناک پر چشمہ جماتے ہوئے اس سپاٹ لہجے میں وصیت پڑھنا شروع کی جس میں عموماً وکیل قانونی دستاویزات پڑھتے ہیں۔

''میرے بچو! میرے پیارے بچو! میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اپنی موت کے بعد تمہارے سامنے ایک اعتراف جرم نہ کیا تو میں قبر میں بھی سکون سے نہیں رہ سکوں گا۔ ایک ایسے جرم کا اعتراف، جس کی ندامت نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔ ہاں! میں نے ایک جرم کیا تھا۔۔۔ ایک بھیانک اور گھناؤنا جرم!

میں پچیس سال کا تھا اور پیرس بار میں وکالت کرتے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ پیرس میں دوسرے بہت سے ایسے نوجوانوں کی طرح، جو دور دراز کے دیہات سے اس شہر میں کسی واقفیت، رشتہ داری یا جان پہچان کے بغیر قسمت آزمائی کرنے آجاتے ہیں، میں بھی اس شہر میں بالکل اکیلا تھا۔

کچھ لوگ اکیلے نہیں رہ سکتے۔ میں بھی انہی لوگوں میں سے ہوں۔ شام کے وقت اپنے کمرے میں آتشدان کے سامنے اکیلا بیٹھنا میرے لئے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ ایسے میں مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں اس دنیا میں اکیلا انسان ہوں، اور میرے ارد گرد ان دیکھے خطرات منڈلا رہے ہیں، انجانے اور خوفناک خطرات۔ میرے کمرے اور میرے ہمسائے کے درمیان جو دیوار ہے، وہ ہمسایہ جس کا میں نام تک نہیں جانتا، اس دیوار کے پار وہ مجھ سے اتنا ہی دور ہے جتنے میری کھڑکی میں جھلملانے والے ستارے۔ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو مجھے بخار سا ہونے لگتا ہے۔۔۔ خوف اور اضطراب کا بخار۔۔۔ اور مجھے کمرے کی خاموش دیواروں سے خوف آنے لگتا ہے۔ جس کمرے میں کوئی اکیلا رہتا ہے اس کمرے کی خاموشی اتنی گہری اور پر ملال ہوتی ہے کہ وہ انسانی دماغ پر بھی اثر انداز ہونے لگتی ہے۔ کمرے میں رہنے والا اس خاموشی سے اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ کسی کرسی یا میز کی ہلکی سی چرچراہٹ بھی کان کے پردے پھاڑ دیتی ہے۔ نجانے کتنی مرتبہ۔۔۔ اسی سکوت اور سناٹے سے وحشت زدہ کر میں خود اپنے آپ سے باتیں کرنا شروع کر دیتا۔ بلا وجہ۔۔۔ بے ربط و ترتیب بولتا رہتا بس صرف کمرے کا سکوت توڑنے کے لئے۔۔۔ ایسے لمحات میں مجھے اپنی ہی آواز اتنی عجیب اور نامانوس

سنائی دیتی کہ مجھے اس سے بھی خوف آتا۔ کسی خالی گھر میں خود کلامی سے زیادہ وحشت ناک بات کیا ہو سکتی ہے؟ خود اپنی آواز بھی کسی دوسرے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ایک انجانی آواز۔۔۔جس کا کوئی مخاطب نہیں ہے۔۔۔ جس کو سننے والا کوئی نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ کمرے کی خاموشی میں ان الفاظ کے ادا کئے جانے سے پہلے ہی بولنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ کیا کہا جائے گا۔ پھر جب یہ الفاظ ماتم زدہ انداز میں کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹتے ہیں تو ان کی گونج عجیب سی ہوتی ہے۔ایسی گونج جو صرف ایسے الفاظ سے پیدا ہوتی ہے جو خود اپنے ہی خیالات سے بنے ہوئے الفاظ پیدا کرتے ہیں۔

پھر میری ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی۔ جلد ہی وہ لڑکی میرے کمرے میں میرے ساتھ رہنے لگی۔ پیرس میں اس جیسی اور بہت سی نوجوان لڑکیاں پائی جاتی تھیں جن کی آمدن ان کے اخراجات کے لئے ناکافی ہوتی ہیں۔وہ بہت سیدھی سادی اور پیاری سی لڑکی تھی۔اس کے والدین پواسی میں رہتے تھے۔وہ کبھی کبھار ان کے پاس چند روز گزارنے جایا کرتی تھی۔ ہمیں ایک ساتھ رہتے ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس دن مجھے کوئی اور شادی کرنے کے لائق لڑکی ملی تو میں اِس لڑکی کو فوراً چھوڑ دوں گا۔اِس لڑکی کو یقیناً کچھ دے دلا کر رخصت کروں گا، کیونکہ ہمارے معاشرے کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی بھی عورت کے پیار کی ادائیگی کرنا ہوتی ہے۔۔۔اگر عورت غریب ہو تو رقم سے اور اگر امیر ہو تو تحفے تحائف سے۔

پھر ایک روز اس نے مجھے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ مجھ پر تو گویا بجلی گر پڑی اور مجھے یکایک احساس ہوا کہ میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔میں ساری عمر کے لئے اس زنجیر میں جکڑا جاؤں گا۔۔۔یہ بیڑی میری موت تک میرے پاؤں میں پڑی رہے گی۔۔۔میرے حال میں اور میرے مستقبل میں۔۔۔بڑھاپے میں بھی یہ عورت اس بچے کے ناطے سے مجھ سے جڑی رہے گی۔اس ناجائز بچے کی زنجیر۔۔۔جس کی پرورش اور دیکھ بھال مجھے کرنا ہوگی۔۔۔ ساری عمر میرے پاؤں جکڑے رہے گی۔۔۔ساری عمر خود کو اس سے پوشیدہ رکھتے ہوئے اور اس کو دنیا سے پوشیدہ رکھتے ہوئے۔

اس خبر نے میری راتوں کی نیند اڑا دی اور رفتہ رفتہ میرے دل میں عجیب و غریب خیالات

آنے لگے۔ میرے ذہن میں ایک کیڑا کلبلانے لگا۔ میں نے ارادتاً کبھی نہیں سوچا لیکن یہ خیال میرے لاشعور میں جم کر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی پردے کے پیچھے بیٹھا ہو صرف ایک اشارے کا منتظر چھلانگ مار کر سامنے آنے کے لئے۔ کوئی حادثہ بھی تو پیش آ سکتا ہے۔ نجانے کتنے بچے پیدائش سے پہلے بھی تو مر جاتے ہیں۔

اوہ! میں اس لڑکی کی موت نہیں چاہتا تھا۔ مجھے وہ بہت اچھی لگتی تھی۔ لیکن شائد میرے دل میں یہ خواہش دن بدن بڑھتی ہی جاتی تھی کہ یہ بچہ میری نگاہوں کے سامنے آنے سے پہلے ہی مر جائے۔

لیکن ایک روز وہ پیدا ہو گیا۔ اور میرا چھوٹا سا مکان ایک جھوٹ موٹ کا گھر بن گیا۔ جس میں، مَیں وہ لڑکی اور وہ بچہ رہتے تھے۔ دیکھنے میں وہ دوسرے سب بچوں جیسا تھا۔ میں نے اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ باپ کی محبت یوں بھی کافی دیر بعد ظاہر ہوتی ہے۔ پدرانہ محبت میں ممتا کی سی جبلّی اور پرجوش تپش نہیں ہوتی۔ باپ کی محبت دھیرے دھیرے بڑھتی ہے۔ باپ کا ذہن روزمرّہ کے ان تعلقات سے اثر قبول کرتا ہے جو ایک ساتھ رہنے والے لوگوں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔

ایک سال گزر گیا اور غیر ارادی طور پر میں نے گھر سے دور رہنا شروع کر دیا۔ میرا گھر بہت چھوٹا تھا اور اب اس میں ہر جگہ پوتڑے، بچے کے کپڑے، انگلیوں جتنی جرابیں، غرضیکہ لاتعداد مختلف انواع واقسام کی چیزیں ہر جگہ دکھائی دیتی تھیں۔ میں عموماً بچے کے رونے دھونے سے تنگ آ کر گھر سے باہر چلا جاتا تھا۔ وہ ہر بات پر رونے لگتا تھا۔ نہلائے جانے پر۔۔۔ کپڑے تبدیل کئے جانے پر۔۔۔ چھوئے جانے پر۔۔۔ سلائے جانے پر۔۔۔ جگائے جانے پر۔۔۔ وہ روتا رہتا۔۔۔ ہر وقت لگاتار۔

پھر ایک روز ایک دعوت میں میری ملاقات اُس لڑکی سے ہوئی جو بعد میں تمہاری ماں بنی۔ میں پہلی ہی نظر میں اس کی محبت کا اسیر ہو گیا اور میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ وہی میری بیوی بنے گی۔ کچھ عرصہ کی میل ملاقات کے بعد میں اس کے والدین سے ملا اور ان سے بیٹی کا ہاتھ مانگ لیا۔ انہوں نے میری درخواست قبول کر لی اور ہمیں شادی کی اجازت دے دی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں ایک مشکل میں گرفتار ہو گیا۔ اب میرے سامنے

صرف دو ہی راستے تھے۔ یا تو میں ایک ناجائز بچے کا باپ ہونے کے باوجود اس لڑکی سے شادی کر لیتا جس سے میں دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔ اور یا پھر اس کو ساری حقیقت بیان کر دیتا اور اس لڑکی کو۔۔۔ اپنی خوشیوں کو۔۔۔ اپنے مستقبل کو کھو بیٹھتا۔۔۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اگر یہ بات اس کے قدامت پسند اور نام و نسب والے والدین کو معلوم ہو گئی تو وہ ایک لمحے میں انکار کر دیں گے۔ اسی اذیت اور کرب میں ایک ماہ گزر گیا۔ ایک ماہ جس میں خوفناک خیالات چمگادڑوں کی طرح میرے دل کے اندھیروں میں پھڑپھڑاتے رہے۔ میرے دل میں اپنے بیٹے کے لئے نفرت پیدا ہوتی گئی۔۔۔ اس گوشت پوشت کے لوتھڑے کے لئے۔۔۔ اس چیختی چلاتی مخلوق کے لئے۔۔۔ جو میری خوشیوں بھری زندگی کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی تھی۔ میرا بیٹا مجھے اس راہ پر دھکیل رہا تھا جو مایوسی کی گہرائیوں میں غائب ہو جاتی۔ جہاں وہ تمام امیدیں اور تمنائیں ختم ہو جاتی ہیں جن سے جوانی کی قوسِ قزح میں رنگ بھرتے ہیں۔

ایک دن اس لڑکی کی ماں بیمار پڑ گئی اور میں ایک رات کے لئے گھر میں اس بچے کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور سردی اپنے عروج پر تھی۔ باہر یخ بستہ ہوائیں بدروحوں کی مانند رو رہی تھیں۔ وہ لڑکی شام کی ٹرین سے جا چکی تھی۔ میں نے خاموشی سے ڈائننگ روم میں رات کا کھانا کھایا اور دبے پاؤں اس کمرے میں داخل ہوا جس میں بچہ سو رہا تھا۔ میں آتشدان کے سامنے پڑی آرام کرسی پر جا بیٹھا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور کھڑکی کے شیشے لرز رہے تھے۔ کھڑکی میں سے کھلے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ پھر اچانک وہی شیطانی خیال اندھیرے کی چادر چیرتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ میں جب بھی اکیلا ہوتا تو یہ عفریت میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتا، میرے دماغ کو کسی کیڑے کی طرح کھانے لگتا جیسے کینسر گوشت کو کھا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہیں ہوتا میرے دل میں۔۔۔ میرے دماغ میں۔۔۔ میرے سارے جسم میں۔۔۔ اور پھر کسی اژدہے کی مانند مجھے سالم نگل جاتا۔ میں اس کو دور بھگانے کی کوشش کرتا۔۔۔ دھتکارتا۔۔۔ اپنے دماغ میں دوسرے نئے خیالات لانے کی کوشش کرتا جیسے بند کمرے میں کھڑکی کھولنے سے تازہ ہوا کے جھونکے تازگی لاتے ہیں۔ لیکن میں ایک لمحے کے لئے بھی اس سے جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں کہ میں اس وحشت کو بیان کر سکوں۔ یہ وحشت میری روح کو کھائے جاتی

تھی۔اور مجھے ایک درد۔۔۔ جسمانی درد کا احساس ہونے لگا تھا۔ میری زندگی تباہ ہو چکی تھی۔ میں اس دلدل میں سے کیسے نکل سکتا تھا؟اب میں کیسے پیچھے ہٹ سکتا تھا؟ کیسے اعتراف کر سکتا تھا؟وہ جو تمہاری ماں بننے والی تھی میں اس کو دیوانہ وار چاہتا تھا۔اور اس رکاوٹ نے میری دیوانگی کو اور شدید کر دیا تھا۔میرے اندر غصّہ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بہنے لگا اور میرا غیض وغضب پاگل پن کی حدوں کو چھونے لگا۔۔۔ہاں اس رات میں واقعی پاگل ہو گیا تھا۔

بچہ سو رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔اس کو سوتے ہوئے دیکھتا رہا۔یہی وہ لغزش تھی۔۔۔یہی وہ بیج تھا۔۔۔یہی وہ گوشت پوست کا ٹکڑا تھا جس نے مجھے حسرت ویاس کی عمر قید سنا ڈالی تھی۔

وہ سو رہا تھا۔اپنے بستر کی چادروں میں لپٹا ہوا، منہ کھولے ہوئے،اپنے پنگھوڑے میں جو میرے اس بستر کے ساتھ رکھا تھا جس میں نجانے کب سے میں سکون سے نہیں سو سکا تھا۔

اوہ میرے خدا!جو کچھ میں نے کیا وہ میں نے کیسے کر ڈالا؟ مجھے کیا معلوم؟مجھے کس نے مجبور کر دیا تھا؟وہ کون سی شیطانی طاقت تھی جس نے مجھے اپنے قابو میں جکڑ لیا تھا۔مجھے احساس ہی نہ ہوا اور گناہ کا بھوت میرے سر پر سوار ہو گیا۔بس مجھے اتنا یاد ہے کہ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔اس زور سے کہ مجھے اپنے کانوں میں اس کی آواز آ رہی تھی جیسے کسی دھونکنی کی آواز آتی ہے۔بس مجھے یہی کچھ یاد ہے۔۔۔ میرے اپنے دل کی دھڑکن کی دھمک۔۔۔میرے دماغ میں ایک عجیب سی بیقراری برپا تھی۔۔۔ ایک عجیب سی بدحواسی۔میں اس وقت ہذیان اور دیوانگی کے درمیان اس نقطے پر کھڑا تھا جہاں انسان کو اپنے اعمال کا احساس ہوتا ہے اور نہ اپنے ارادوں پر قابو۔

میں نے بچے کے بدن سے اس کا کمبل اور رضائی اتار کر انتہائی آہستگی سے اس کے پیروں کی جانب لپیٹ کر رکھ دیئے۔اب وہ بستر پر صرف ایک قمیص میں پڑا تھا۔وہ سویا رہا۔پھر میں نے کھڑکی کے پاس جا کر اس کے دونوں کواڑ پورے کھول دیئے۔یخ بستہ ہوا کسی قاتل کی مانند اندر داخل ہوئی۔ہوا اس قدر یخ تھی کہ میں ایک جانب ہو گیا اور کمرے کی موم بتیوں کی لو لرزنے لگی۔میں یوں ہی کھڑکی کے ساتھ کھڑا رہا،مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پلٹ کر دیکھ سکوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔برفیلی ہوا میرے ماتھے،میرے گالوں،میرے ہاتھوں

کو ٹھنڈا کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی رہی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں وہاں کتنی دیر کھڑا رہا۔ میں کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ پھر یک لخت کھانسی کی ایک کمزور اور دھیمی سی آواز نے جیسے میرے سارے وجود کو جھنجھوڑ کرر کھ دیا۔

یہ احساس مجھے آج تک اپنے بالوں کی جڑوں تک میں محسوس ہوتا ہے۔

میں نے لپک کر کھڑکی کے دونوں پٹ بند کئے اور بھاگتا ہوا بچے کے پنگھوڑے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ ابھی تک منہ کھولے سویا ہوا تھا۔ میں نے اس کے چھوٹے سے پیر کو چھوا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے اس کا کمبل اور رضائی اس کو اوڑھا دی۔

پھر نجانے کیا ہوا۔ میرا دل یکا یک ترس، پیار اور شفقت سے بھر گیا۔ اس معصوم کے لئے جس کو چند لمحے قبل میں نے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے جھک کر اس کے ریشمی سنہرے بالوں کو چوما اور واپس آتشدان کے سامنے اپنی آرام کرسی پر آن بیٹھا۔

میں حیرت اور دہشت سے اپنی اس حرکت پر غور کرتا رہا۔ خود سے پوچھتا رہا کہ میری روح میں وہ طوفان کہاں سے آیا جس میں مَیں اپنی راہ ہی کھو بیٹھا تھا۔ خود پر قابو کھو بیٹھا تھا۔ جیسے کسی مدہوش ملاح کو طوفان میں اپنی ناؤ کی سمت کا احساس نہیں ہوتا۔

بچہ ایک مرتبہ پھر کھانسا اور میرے دل میں جیسے کسی نے چھرا گھونپ دیا ہو۔ اگر وہ مر گیا تو؟ اوہ میرے خدا! اوہ میرے خدا! میں کیا کروں گا؟

میں دوبارہ اٹھ کر پنگھوڑے کے پاس گیا اور موم بتی کی روشنی میں جھک کر اس کو تکتا رہا۔ اس کی چھاتی کا زیر و بم دیکھ کر مجھے قدرے تسلّی ہوئی۔ اور پھر وہ دوسری مرتبہ کھانسا۔ مجھ پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور میرے ہاتھ سے موم بتی چھوٹ گئی۔ موم بتی اٹھاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میری کنپٹیوں سے پسینے کی ایک دھار بہہ کر میری گردن کے جانب جارہی تھی۔ اس ٹھنڈے پسینے کی ایک دھار جو صرف روح کے عذاب سے بہتا ہے۔

صبح ہونے تک میں اس کے پنگھوڑے کے ساتھ کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ جب وہ سکون سے سوتا تو میں بھی سکون سے کھڑا رہتا۔ اس کے کھانسنے کی ہر ناتواں آواز مجھے جیسے کسی چابک کی مانند لگتی۔ وہ صبح اٹھا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور وہ بمشکل تمام سانس لے رہا تھا۔ اس

کے پھیپھڑوں سے کھڑ کھڑانے کی آواز آرہی تھی۔ جیسے ہی نوکرانی آئی میں نے اس کو الٹے قدموں ڈاکٹر کو بلانے روانہ کر دیا۔ ڈاکٹر قریباً ایک گھنٹے کے بعد آیا اور بچے کا معائنہ کرنے کے بعد بولا ''اس کو سردی تو نہیں لگی؟'' میں کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا۔ پھر میں نے پوچھا، ''کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب؟ کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟'' اس نے جواب دیا، ''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں شام کو پھر آؤں گا۔'' وہ شام کو پھر آیا۔ میرے بیٹے نے سارا دن نیم خوابیدگی کی حالت میں گزارا۔ اس پر وقتاً فوقتاً کھانسی کے دورے پڑتے رہے۔ رات کے دوران اس کے پھیپھڑوں کی حالت مزید بگڑ چکی تھی۔

اس نے دس دن اسی حالت میں گزارے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ ان دس دنوں میں مَیں نے وہ گھنٹے کیسے گزارے جن کے دوران دن رات کے اندھیرے میں اور رات دن کی روشنی میں تبدیل ہوتی ہے۔

پھر وہ مر گیا۔

اور پھر اس دن اور اس لمحے کے بعد آج تک ایک منٹ بھی ایسا نہیں گزرا کہ جس میں وہ یادیں دہکتی ہوئی سلاخوں کی طرح میرے دماغ میں نہ گھسیڑی گئی ہوں۔۔۔ جو میرے دل کو نچوڑے نہ ڈالتی ہوں۔۔۔ جو وحشی درندوں کی طرح میری روح کے اندھیروں میں سے چھلانگ مار کر باہر نہ نکل آتی ہوں۔

کاش میں پاگل ہی ہو جاتا!''

مسٹر پوارل دلاؤ ولٹ نے حسب عادت اپنا چشمہ اوپر کیا جیسا وہ کوئی بھی دستاویز پڑھنے کے بعد کیا کرتے تھے۔ مرحوم کے تینوں وارثوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔۔۔ خاموشی سے۔۔۔ سپاٹ اور زرد چہروں کے ساتھ۔ پورے ایک منٹ بعد وکیل صاحب پھر بولے، ''اس خط کو فوراً ضائع کرنا ہو گا۔'' مرحوم کے بیٹے اور بیٹی دونوں نے اثبات میں سر جھکا دیئے۔ وکیل صاحب نے ایک موم بتی جلائی اور بڑی احتیاط سے ان صفحات کو وصیت کے دوسرے کاغذات سے علیحدہ کیا۔ پھر انہوں نے ان کاغذات کو آگ دکھائی اور جیسے ہی لپکتے ہوئے شعلے ان کو نگلنے لگے تو ان کو آتشدان میں پھینک دیا۔ پھر وہ تینوں بیٹھے ان کاغذات کو جلتا دیکھتے رہے۔ چند ہی لمحوں میں وہ سیاہ ہو گئے۔ چونکہ ان سیاہ سوختہ پتوں میں بھی حروف

دکھائی دیتے تھے اس لئے مرحوم کی بیٹی نے اپنے جوتے کی نوک سے ان کو آتشدان میں پڑی پرانی راکھ میں مسل دیا۔ وہ تینوں دیر تک وہاں کھڑے راکھ کو دیکھتے رہے۔ شائد ان کے دلوں میں کوئی موہوم سا اندیشہ تھا کہ کہیں یہ راز اس راکھ میں سے بھی افشانہ ہو جائے۔

5

اعتراف

La Confession

مار گریط دتیریّل نزع کے عالم میں تھی۔ گواس کی عمر صرف چھپّن سال تھی لیکن وہ کم از کم پچھتر سال کی دکھائی دیتی تھی۔اس کی سانس اکھڑ رہی تھی، اس کا چہرہ بستر کی چادر کی مانند سفید ہو رہا تھا۔اس کا بدن شدید کپکپاہٹ سے لرز رہا تھا اور چہرہ درد سے اینٹھ رہا تھا۔اس کی آنکھوں پر ایسا سکتہ طاری تھا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو۔

اس کی بہن سوزانؔ، جو عمر میں اس سے چھ سال بڑی تھی، بستر کے ساتھ بیٹھی سسکیاں لیتے ہوئے رو رہی تھی۔مریضہ کے بستر کے ساتھ رکھی ایک چھوٹی تپائی پر سفید رومال پر دو موم بتیاں روشن تھیں کیونکہ اب صرف پادری کا انتظار تھا جو مرحومہ کی آخری رسومات ادا کرتا۔ کمرے میں عنقریب آنے والی موت کا سایہ چھایا ہوا تھا۔ہر طرف ادویات کی بوتلیں اور شیشیاں بکھری پڑی تھیں۔جگہ جگہ کپڑے، جنہیں پاؤں کی ٹھوکر یا جھاڑو سے کونے میں پھینک دیا گیا تھا۔بے ترتیبی کے عالم میں پڑی ہوئی کرسیاں بھی جیسے موت کے خوف سے ادھر ادھر بھاگتی رہی ہوں۔موت۔۔۔دہشت ناک موت۔۔۔اسی کمرے میں کہیں موجود تھی۔۔۔چھپی ہوئی۔۔۔انتظار میں۔

ان دونوں بہنوں کی کہانی بھی بہت دردناک تھی۔علاقے میں دور دور تک لوگ ان

کی زندگی کے المناک واقعات سے آگاہ تھے۔ نجانے کتنی آنکھیں ان کی کہانی سن کر پرنم ہو چکی تھیں۔

بڑی بہن سوزاںؔ کو کسی زمانے میں ایک نوجوان بہت چاہتا تھا۔ وہ بھی اس کی محبت میں گرفتار تھی۔ سب لوگ شادی کی تاریخ کے اعلان کے منتظر تھے کہ اچانک وہ نوجوان، ہنری دساںپیئرؔ، جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ حزن و ملال اور حسرت و یاس کی ماری سوزاںؔ نے کبھی شادی نہ کرنے کی قسم کھالی۔ اس نے اپنی قسم پوری کر کے بھی دکھادی۔ اس نے بیواؤں کا لباس زیبِ تن کرلیا اور اس دن کے بعد اسے کبھی کسی دوسرے لباس میں نہ دیکھا گیا۔

پھر ایک روز اس کی چھوٹی بہن مارگریٹؔ، جو صرف بارہ سال کی تھی، اپنی بڑی بہن کی بانہوں میں آن گری اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی، ''بڑی آپا۔ مجھ سے آپ کا یہ دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ اپنی ساری زندگی تنہائی میں آنسو بہاتے ہوئے گزار دیں۔ میں کبھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ میں بھی کبھی شادی نہیں کروں گی۔ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گی۔ ہمیشہ۔ ہمیشہ۔'' سوزاںؔ نے بچی کے معصوم جذبات سے مغلوب ہو کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔

لیکن بچی نے بھی اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ خاندان والوں کی سرزنش اور اپنی بڑی بہن کی منّت و سماجت کے باوجود اس نے کبھی شادی نہ کی۔ حالانکہ وہ خوبصورت تھی، بہت خوبصورت۔ بہت سے رشتے آئے لیکن اس نے ان سب کو ٹھکرا دیا۔ اس نے اپنی بہن کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

دونوں نے اپنی بقیہ زندگی کا ایک ایک دن ایک ساتھ گزارا۔ وہ ایک مرتبہ بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئیں۔ وہ جہاں بھی جاتیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ جاتیں۔ لیکن مارگریٹؔ کے چہرے پر ہمیشہ ایک افسردگی چھائی رہتی، جیسے شائد اس کی بے لوث قربانی اسے اندر ہی اندر سے گھن کی طرح کھائے جاتی ہو۔ وہ اپنی بڑی بہن سے کہیں زیادہ بوڑھی دکھائی دیتی تھی، تیس سال کی عمر میں ہی اس کے بالوں میں چاندی جھلکنے لگی تھی۔ وہ عموماً بیمار رہتی تھی۔ کوئی انجانا دکھ اس کو چاٹے جاتا تھا۔ اور اب وہ اپنی بڑی بہن سے پہلے بسترِ مرگ پر پڑی تھی۔ چوبیس گھنٹے سے اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا۔ سورج کی پہلی کرن پھوٹنے

سے پہلے اس نے صرف یہی کہا تھا، ''پادری کو بلائیں۔ اب وقت آن پہنچا ہے۔''

اس کے بعد وہ خاموشی سے خوف و ہراس بھری نگاہوں چھت کو تکتی رہی۔ کبھی کبھار اس کا پورا جسم لرز اٹھتا۔ کپکپاتے ہوئے ہونٹ کبھی کھلتے اور کبھی بند ہوتے جیسے کوئی ان کہے الفاظ اس کے دل سے باہر آنے کو تڑپ رہے ہوں لیکن ہونٹوں کی قید سے آزاد نہ ہو پاتے ہوں۔

اس کی بہن سے، جو بستر کے ساتھ فرش پر بیٹھی تھی، اپنی چھوٹی بہن کی یہ اذیت ناک کیفیت دیکھی نہ جاتی تھی، اور وہ پائنتی کے ساتھ ماتھا ٹکائے صرف یہی الفاظ دہرائے جاتی تھی، ''مار گو، میری مُنّی! مار گو، میری مُنّی!'' وہ ہمیشہ اس کو ''میری مُنّی'' کہہ کر پکارتی تھی اور چھوٹی بہن اس کو ہمیشہ ''بڑی آپا'' کہا کرتی تھی۔

باہر کوریڈور میں قدموں کی آواز بلند ہوئی۔ دروازہ کھلا۔ گرجا گھر میں کام کرنے والا ایک کمسن لڑکا اندر داخل ہوا اور اس کے پیچھے سفید چغے میں ملبوس پادری اندر آیا۔ پادری کو دیکھتے ہی مار گریٹ یکایک اٹھ بیٹھی، اس کے ہونٹ پھر سے کپکپانے لگے اور اس کے منہ سے چند ناقابلِ فہم الفاظ ابھرے۔ اس کی سفید استخوانی انگلیاں بستر کی چادر کو یوں بھینچنے لگیں جیسے اس کو چاک کر ڈالیں گی۔ پادری سیموں اس کے قریب آیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اس کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا۔ پھر پادری دھیمی اور پر سکون آواز میں بولا۔ ''خدا تمہاری مغفرت کرے، میری بچی! ہمّت سے کام لو۔ اب وقت آن پہنچا ہے۔ بولو میری بچی!''

مار گریٹ پر کپکپاہٹ کا ایک اور دورہ پڑا جس کی شدّت سے اس کا بستر تک کانپنے لگا۔ پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ''میرے پاس بیٹھ جاؤ، بڑی آپا۔ میری بات سنو!''

پادری نے جھک کر اپنا ہاتھ زمین پر گری ہوئی سوزان کی جانب بڑھایا۔ اسے بستر کے ساتھ رکھے ہوئے صوفے پر بٹھایا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں دونوں بہنوں کا ایک ایک ہاتھ تھامے ہوئے، چہرہ آسمان کی جانب اٹھا کر بولا۔ ''میرے خدا! ان دونوں کو ہمّت عطا فرما! ان پر اپنا رحم و کرم فرما!''

اور مار گریٹ بولنے لگی۔ الفاظ اس کے ہونٹوں سے ایک ایک کر کے نکلنے لگے۔۔۔ پھٹی ہوئی آواز میں۔۔۔ جیسے ہر لفظ کانٹوں میں گھسیٹ کر نکالا گیا ہو۔

''مجھے معاف کردو! بڑی آپا۔ مجھے معاف کردو۔ اوہ! کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ میں اپنی ساری زندگی اس لمحے سے کتنی خوفزدہ تھی۔۔۔ ساری زندگی۔''

سوزآن آنسوؤں سے بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کیا معاف کردوں، مُنّی؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم نے تو مجھے سب کچھ دیا ہے۔ تم نے تو اپنا سب کچھ مجھ پر قربان کردیا ہے۔ تم تو ایک فرشتہ ہو۔۔۔''

لیکن مارگریٹ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''چپ کرو! چپ کرو! مجھے بولنے دو۔۔۔ مجھے مت روکو۔۔۔ اوہ کتنی خوفناک بات ہے۔۔۔ بس مجھے سب کچھ کہہ ڈالنے دو۔۔۔ آخر تک مجھے ٹوکے بغیر۔۔۔ سنو۔۔۔ تمہیں یاد ہے؟۔۔۔ تمہیں ہنری یاد ہے۔۔۔؟''

سوزآن نے ایک جھرجھری لی اور اپنی بہن کو تکتی رہی۔ اسکی چھوٹی بہن بولتی گئی۔

''ساری بات سمجھنے کے لئے تمہیں ساری بات سننا پڑے گی۔ میں بارہ سال کی تھی، صرف بارہ سال کی۔ تمہیں اچھی طرح یاد ہو گا؟ تمہیں یاد ہو گا کہ میں کتنی لاڈلی ہوا کرتی تھی۔ میں جو چاہتی کیا کرتی تھی!۔۔۔ تمہیں یاد ہو گا کہ کیسے میرے لاڈ اٹھائے جاتے تھے؟۔۔۔ سنو!۔۔۔ پہلی مرتبہ جب وہ ہمارے گھر آیا تھا تو اس نے گھڑسواری کے لباس کے ساتھ چرمی بوٹ پہن رکھے تھے۔ وہ ہمارے گھر کی سیڑھیوں کے سامنے اپنے گھوڑے سے اترا تھا۔ اس نے اپنے لباس کے بارے میں ہم سے معذرت کی تھی کیونکہ وہ ابّا جان کیلئے کوئی ضروری اطلاع لایا تھا۔ تمہیں یاد ہے ناں؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ کچھ مت کہو! بس سنتی رہو! جب میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا تو میں دم بخود رہ گئی تھی۔ وہ اتنا خوبصورت تھا! اور جتنی دیر وہ باتیں کرتا رہا میں مہمان خانے کے ایک کونے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ عمر بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔۔۔ کتنی دہشتناک ہوتی ہے! ہاں۔۔۔ میں اس کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ پھر وہ ہمارے گھر آتا رہا۔۔۔ بارہا۔۔۔ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ اپنی روح سے دیکھتی تھی۔۔۔ میں اپنی عمر کے لحاظ سے کافی بڑی تھی۔ اور اپنی عمر کے لحاظ سے کہیں زیادہ چالاک۔ وہ بہت مرتبہ آیا تھا۔۔۔ وہ ہر وقت میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ میں اکیلے میں اس کا نام سرگوشیوں میں پکارتی رہتی: ہنری دساّمپیئر۔۔۔ ہنری دساّمپیئر!

پھر لوگ کہنے لگے کہ وہ تم سے بیاہ کرنے چلا ہے۔ غم کے مارے میرا کلیجہ پھٹ گیا۔ اوہ بڑی آپا! اتنا غم۔۔۔ اتنا دکھ۔۔۔! میں تین راتیں لگاتار روتی رہی۔ وہ ہر روز آتا تھا دوپہر کے کھانے کے بعد۔۔۔ تمہیں یاد ہے نا؟ نہیں۔۔۔ چپ رہو، بس سنتی رہو! تم اس کے لئے بسکٹ بناتی تھی، میدے، مکھن اور دودھ کے ساتھ، جو وہ بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ مجھے معلوم ہے تم کیسے بناتی تھی۔۔۔ اگر چاہوں تو اب بھی بنا سکتی ہوں۔ وہ ایک ہی نوالے میں پورا بسکٹ منہ میں اتار لیتا اور شراب کا ایک گلاس حلق میں انڈیل دیتا۔ پھر وہ کہتا، "لذیذ۔۔۔ بہت لذیذ تھا"۔ تمہیں یاد ہے نا کیسے کہا کرتا تھا۔

میں حسد کی آگ میں جھلستی رہی۔۔۔ پگھلتی رہی۔ تمہاری شادی کے دن قریب آتے گئے۔ صرف پندرہ روز باقی تھے۔ میں پاگل ہو چلی تھی۔ میں خود سے کہتی، 'وہ سوزآن سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔ وہ مجھ سے شادی کرے گا جب میں بڑی ہو جاؤں گی۔ میں کسی اور سے اتنا پیار نہیں کر سکتی۔۔۔ لیکن ایک شام، شادی سے دس دن پہلے، تم دونوں باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔۔۔ چاند کی روشنی میں۔۔۔ وہاں صنوبر کے درخت کے نیچے۔۔۔ اس نے تمہیں۔۔۔ تمہیں اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔۔۔ اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔۔۔ اور پھر۔۔۔ کتنی ہی دیر تک۔۔۔ تمہیں یاد ہے نا؟ شائد تمہارے لئے پہلا موقع تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ تم جب گھر میں داخل ہوئی تھی تو تمہارا چہرہ تمتما رہا تھا۔

میں نے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ میں وہیں تھی۔۔۔ جھاڑیوں کے پیچھے۔ میں غصّے کے مارے کانپنے لگی تھی۔ میرا بس چلتا تو میں تم دونوں کی جان لے لیتی۔

بس میں نے فیصلہ کر لیا: وہ سوزآن سے شادی نہیں کرے گا۔ کبھی نہیں! وہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔ مجھ سے یہ غم سہا نہیں جائے گا۔ پھر اچانک ایک ہی لمحے میں میرے دل میں اس کے لئے نفرت کا سیلاب امڈ آیا۔۔۔ جیسے کسی دریا پر بندھا بند ٹوٹ جائے۔

تم جانتی ہو میں نے کیا کیا؟۔۔۔ سنو! میں نے دیکھا تھا کہ ہمارے باغ کے مالی آوارہ کتوں کو مارنے کے لئے گوشت کی گولیاں بناتے تھے۔ وہ پتھر سے ایک بوتل توڑتے اور شیشے کی باریک کرچیاں کیا کرتے۔ پھر وہ شیشے کا یہ سفوف گوشت کی گولیوں میں گوندھ دیتے۔

میں نے امّی جان کی دوا کی ایک شیشی چرائی اور ہتھوڑی سے اس کی انتہائی باریک کرچیاں کر ڈالیں۔ میں نے یہ باریک چمکدار سفوف اپنی جیب میں ڈال دیا۔ دوسرے روز تم حسب معمول اس کے لئے بسکٹ تیار کر رہی تھی۔ میں نے موقع پاتے ہی ایک چھری سے ان میں سوراخ کئے اور ان میں یہ سفوف بھر دیا۔۔۔اس روز اس نے تین بسکٹ کھائے تھے۔۔۔میں نے بھی ایک کھایا تھا۔۔۔باقی چھ بسکٹ میں نے باغ کے تالاب میں پھینک دئے۔۔۔ تین دن بعد ہمارے دونوں راج ہنس مرے پڑے تھے۔۔۔ تمہیں یاد ہے نا؟ ۔۔۔اوہ! کچھ مت کہو۔۔۔بس سنو! سنو!۔۔۔بس میں موت کے منہ میں جانے سے بچ گئی۔۔۔ لیکن میں ہمیشہ بیمار رہا کرتی تھی۔۔۔۔سنو۔۔۔وہ مر گیا تھا۔۔۔تم جانتی ہو۔۔۔سنو ۔۔۔یہ تو کچھ بھی نہیں۔۔۔بعد میں بہت بعد۔۔۔۔اب بھی۔۔۔اس سے بھی خوفناک بات۔۔۔سنو۔۔۔۔

ساری زندگی، اپنی ساری زندگی۔۔۔اوہ کیسا عذاب تھا! میں نے فیصلہ کر لیا: میں اپنی بہن کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ اور اس کو اپنی موت کے وقت سب کچھ بتا دوں گی۔ ۔۔۔بس! اور اس وقت سے آج تک میں اس لمحے کا انتظار کرتی رہی، اس لمحے کا انتظار جب میں تمہیں سب کچھ بتا ڈالوں گی۔۔۔اب وہ لمحہ آن پہنچا ہے۔۔۔میرے خدا۔۔۔ کتنی خوفناک بات ہے۔۔۔اوہ! بڑی آپا!

میں ہمیشہ یہی سوچتی تھی۔۔۔ صبح شام۔۔۔دن رات۔ مجھے یہ بات تمہیں بتانا ہو گی، بس ایک مرتبہ۔ میں اس وقت کا انتظار کرتی رہی۔ اوہ میرے خدا کتنا کربناک انتظار۔۔۔ لیکن بس اب یہ ختم ہو چکا ہے۔۔۔بس اب اور کچھ نہ کہو۔۔۔ لیکن اب میں ڈر رہی ہوں۔۔۔میں خوفزدہ ہوں۔۔۔ابھی، جب میں مر جاؤں گی تو میرا اس سے آمنا سامنا ہو گا۔۔۔میں اس کو پھر سے دیکھ پاؤں گی۔۔۔ کبھی تم نے سوچا تھا؟۔۔۔ کہ میں اس کو تم سے پہلے دیکھ سکوں گی۔۔۔مجھ میں ہمّت نہیں ہے۔۔۔ لیکن کیا کروں۔۔۔میں مرنے لگی ہوں۔۔۔میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو۔۔۔میں بس یہی چاہتی ہوں۔۔۔میں تمہاری معافی کے بغیر اس کا سامنا نہیں کر سکتی۔۔۔اوہ! پادری صاحب اس سے کہیں کہ مجھے معاف کر دے! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں۔۔۔میں معافی کے بغیر مر نہیں سکتی۔"

وہ خاموش ہو گئی اور اس کے سانس اکھڑنے لگی۔بستر کی چادر اس کی اینٹھتی ہوئی استخوانی انگلیوں میں لپٹی جاتی تھی۔سوزانؔ اس دوران اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بیٹھی تھی۔وہ اُس کے بارے میں سوچ رہی تھی جسکے پیار کے ساتھ وہ اپنی ساری زندگی بتا سکتی تھی۔وہ اکٹھے کتنی خوشیوں بھری زندگی گزار سکتے تھے۔اس کے ذہن میں رہ رہ کر اس کی شبیہہ ابھر رہی تھی جو گزرے ہوئے سالوں میں گم ہو چکی تھی۔وہ دھندلاتا ہوا ماضی جو کبھی مٹ نہ سکا تھا۔اپنے جب مر جاتے ہیں تو۔۔۔ کیسے دل کچل کر چل دیتے ہیں!اوہ!وہ بوسہ!وہ پہلا۔۔۔وہ آخری بوسہ! وہ اس کی روح پر نقش ہو چکا تھا۔اور اس کے بعد کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔اس کے سارے وجود میں کچھ بھی تو نہیں!

پادری اچانک کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا، ''سوزانؔ! تمہاری بہن موت کی دہلیز پر کھڑی ہے۔''

سوزانؔ نے اپنے چہرے سے ہاتھ اٹھائے۔اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔وہ لپک کر آگے بڑھی اور اپنی بہن کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔فرطِ جذبات سے اپنی بہن کا چہرہ چومتے ہوئے، سسکیوں کے درمیان وہ بولی، ''میں نے تمہیں معاف کیا، مُنّی! میں نے تمہیں معاف کیا۔''

6

فسوں

La Fascination

میں آپ کو اس شخص کا نام بتا سکتا ہوں نہ ہی اس کا اتا پتا۔ یہاں سے بہت دور سمندر کے کنارے وہ ایک تپتا ہوا لیکن زرخیز علاقہ تھا۔ ہم صبح ہی سے ساحل پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ ہماری ایک جانب دھوپ میں چلچلاتا ہوا نیلگوں سمندر اور دوسری جانب لہلاتے ہوئے کھیت حدِّ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ دھیمی دھیمی سمندری لہروں سے چند قدم دور ہی پھول اگے ہوئے تھے۔ ہوا قدرے مرطوب تھی، اور اس حدّت میں زرخیز مٹی کی سوندھی خوشبو گندھی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہر سانس کے ساتھ پھولوں کا زرِ گل سینے میں اترتا جا رہا ہو۔

گزشتہ شام مجھے بتایا گیا تھا کہ سمندر کے اندر بڑھے ہوئے زمین کے ایک ٹکڑے پر سنگتروں کے باغ میں ایک فرانسیسی رہتا ہے۔ اس کی مہمان نوازی مشہور تھی۔ وہ کون تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ دس سال قبل یہاں آیا تھا اور یہ زمین خرید کر اس میں انگور اور پھلوں کے باغ کاشت کر ڈالے۔ اس شخص نے اپنی زمین پر بہت محنت سے کام کیا۔ اس کے کام میں جذبہ، ولولہ اور ایک عجیب سا ہیجان دیکھا جاتا تھا۔ ہر ماہ، ہر سال وہ یکسوئی سے مشقت کرتا رہا۔ اپنی زمینوں میں اضافہ کرتا چلا گیا۔ زرخیز زمین پر کام کرتا رہا اور اپنی انتھک محنت کے بل پر دولت کے انبار لگاتا چلا گیا۔

لیکن دولت کے باوجود اس کی محنت میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ اب بھی سورج نکلنے سے پہلے کھیتوں میں جا پہنچتا اور غروبِ آفتاب تک ایک ایک چیز کی نگرانی کرتا۔ اس کا بس ایک ہی مقصد تھا، دولت کی کبھی ختم نہ ہونے والی وہ حرص جس کی تکمیل ہو سکتی ہے نہ ہی تسکین۔ حالانکہ بظاہر اًاب اس کے پاس بہت دولت تھی۔ جب میں اس کے گھر کے قریب پہنچا تو سورج ڈھلنے کو تھا۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا اس کا گھر سنگتروں کے باغ کے درمیان میں تھا۔ گھر کافی وسیع و عریض لیکن قدرے سادہ تھا اور سمندر کے عین سامنے واقع تھا۔ میں قریب پہنچا تو دروازے سے ایک لمبی داڑھی والا شخص نمودار ہوا۔ سلام کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے ایک رات گزارنے کی اجازت دے گا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور خوشدلی سے مسکراتے ہوئے بولا، ''کیوں نہیں۔ اندر تشریف لائیے، جناب۔ اسے اپنا ہی گھر جانئے!''

وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا اور بہت پر سکون اور پر اہتمام انداز سے ایک نوکر میری تواضع پر معمور کر دیا جو صرف کسی جہاندیدہ شخص کا ہی خاصہ ہوتا ہے۔

پھر یہ کہتے ہوئے وہ چلا گیا، ''جب آپ تیار ہو کر نیچے آجائیں گے تو ہم رات کا کھانا کھائیں گے۔''

ہم نے سمندر کی جانب کھلے ایک چبوترے پر رکھی میز پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے رات کا کھانا تناول کیا۔ میں نے اس سے اس انجانے لیکن زرخیز ملک کے بارے میں سوالات کئے۔ اس نے مسکراتے ہوئے لیکن لاابالی انداز میں جواب دیا، ''ہاں۔ یہ ملک خوبصورت ہے لیکن جب کوئی اس ملک سے دور ہو جہاں محبوب بستا ہو تو کوئی ملک بھی اچھا نہیں لگتا۔''

''آپ کو فرانس یاد آتا ہے؟''

''مجھے پیرس بہت یاد آتا ہے۔''

''تو پھر آپ لوٹ کیوں نہیں جاتے؟''

''اوہ! ہاں۔۔۔ ایک دن ضرور لوٹ جاؤں گا۔''

پھر ہم پیرس کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔۔۔ پیرس کی گلیوں اور پیرس کی زندگی کے بارے میں۔ اس نے مجھ سے پیرس کے بارے میں ایسے سوالات کئے کہ مجھے احساس ہوا کہ وہ پیرس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔۔۔ خصوصاً پیرس کے تھیٹر کے اداکاروں کے نام جو

شہر میں زبان زدِ عام تھے۔

''تارتوئی میں آجکل کون کون جاتا ہے؟''

''وہی سب پرانے چہرے سوائے ان کے جو گزر چکے ہیں۔''

میں اس کے چہرے کو غور سے تکتا رہا، ایک موہوم سا ہیولہ میری یادوں میں ابھرنے لگا تھا۔ میں نے اس کو کہیں نہ کہیں دیکھا ضرور تھا۔۔۔ لیکن کہاں؟۔۔۔ کب؟

اگرچہ اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور افسردگی کے تاثرات نمایاں تھے لیکن اس کے باوجود وہ توانا اور مستقل مزاج دکھائی دیتا تھا۔ اس کے داڑھی اسکے سینے تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے بال جھڑ رہے تھے۔۔۔ لیکن بھنوئیں گھنی اور مونچھیں بدستور لمبی تھیں۔

سورج سمندر میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا اور ساحل پر گہری دھند چھانے لگی تھی۔ سنگترے کے درختوں کی تیز خوشبو ہر طرف پھیلنے لگی تھی۔ لیکن اس کی نگاہیں میرے چہرے پر ثبت تھیں۔ جیسے وہ میرے چہرے میں دور کہیں مادیلین سے رُوبرُو ہو جانے والی درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں چھپے راستے کی جانی پہچانی شبیہہ تلاش کر رہا ہو۔

''کیا آپ بوطریل کو جانتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''کیا وہ اب بھی ویسا ہی ہے؟''

''ہاں۔ بس اس کے بال اب سفید ہو چکے ہیں۔''

''اور لاریدامی؟''

''وہ ویسا ہی ہے۔''

''اور اداکارائیں؟ مجھے اداکاراؤں کے بارے میں بتائیں۔۔۔ اچھا بتائیں، کیا آپ سوزان ویرنے کو جانتے ہیں؟''

''ہاں۔ لیکن اب اس کا دور ختم ہو چکا ہے۔''

''آہ۔۔۔ اور سوفی آستینے؟''

''وہ مر گئی۔''

''بیچاری۔ اور کیا۔۔۔ کیا آپ۔۔۔؟''

وہ یکا یک رک گیا۔اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ ایک بدلی ہوئی آواز میں بولا، ''نہیں۔ بہتر ہو گا کہ ہم اس موضوع پر مزید بات نہ ہی کریں۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو گا۔'' پھر جیسے وہ موضوع بدلنا چاہتا ہو، ''کیا آپ اندر چلنا پسند کریں گے؟''

''جی ہاں۔''

وہ میرے آگے آگے اندر داخل ہوا۔ نچلی منزل کے کمرے انتہائی کشادہ لیکن خالی اور ویران دکھائی دیتے تھے۔ سیاہ فام ملازموں نے میزوں پر پلیٹیں اور گلاس بکھیر چھوڑے تھے۔ اور وہ خود اس وسیع و عریض گھر میں ادھر ادھر گھومتے پھر رہے تھے۔ ایک دیوار پر دو رائفلیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ کمروں کے کونوں میں مختلف اشیاء کاٹھ کباڑ کی مانند پھینکی گئی تھیں۔۔۔۔ بیلچے، مچھلی کے شکار کی بنسیاں، کھجور کی خشک پتے۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ یہاں ایسے لوگ بستے ہیں جو شام ڈھلے واپس لوٹتے ہیں اور صبح سویرے پھر اپنے کام پر نکل جاتے ہیں۔

میزبان میری جانب مڑا اور مسکرایا، ''یہ ایک ملک بدر شخص کا گھر ہے۔۔۔ بلکہ کوٹھڑی ہے۔ میرا اپنا کمرہ قدرے بہتر ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔''

کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں کسی نوادرات کی دکان میں گھس آیا ہوں۔ کمرہ مختلف قسم کی انواع و اقسام کی چیزوں سے بھرا پڑا تھا، عجیب و غریب چیزیں جو میرے خیال میں کسی گزرے ہوئے دور کی یادگاریں یا نشانیاں تھیں۔ دیواروں پر مشہور مصوّروں کی دو دلکش تصاویر آویزاں تھیں۔ آرائشی پردے، تلواریں، پستول، اور ایک دیوار کے عین وسط میں ایک سنہری چوکھٹے میں سفید مخمل کا ٹکڑا لٹکا ہوا تھا۔ تجسّس کے مارے میں اس کی جانب بڑھا اور قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ چمکدار مخمل پر بالوں کا ایک کلپ نصب تھا۔ میرے میزبان نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا،

''یہاں یہی وہ واحد چیز ہے جس کو میں دیکھتا ہوں۔۔۔ وہ واحد چیز جسے میں گزشتہ دس سال سے دیکھ رہا ہوں۔ پرُودھوم کا قول ہے، ''یہ تلوار میری زندگی کے اہم ترین دن کی نشانی ہے''، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ، ''یہ کلپ میری ساری زندگی ہے''۔''

میں کسی رسمی سے جواب کی تلاش میں کچھ دیر خاموش رہا لیکن پھر رہ نہ سکا، ''کسی

عورت نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے؟''

اس نے فوراً جواب دیا، ''نہیں۔۔۔ بلکہ یوں کہیں کہ میں کسی بدبخت کی طرح آج بھی ذلیل ہو رہا ہوں۔''

''لیکن چلیں باہر بالکونی پر چلتے ہیں۔ ابھی کچھ لمحے قبل ایک نام میرے ہونٹوں پر آیا تھا جس کو کہنے کی مجھ میں ہمّت نہیں تھی۔۔۔ کیوں کہ اگر آپ کہہ بیٹھتے ''مر گئی'' جیسے آپ نے سونی آستیئے کے بارے میں کہا تھا تو میں۔۔۔ میں اس وقت پستول کی ایک گولی اپنے بھیجے میں اتار چکا ہوتا۔''

ہم دونوں باہر بالکونی پر نکل گئے جہاں سے ہمیں اپنے دائیں بائیں دونوں جانب سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ اور سمندر کی دونوں جانب اونچے اونچے پہاڑ۔ سورج مکمل طور پر غروب ہو چکا تھا لیکن اس کی سرخی ابھی تک افق پر پھیلی ہوئی تھی۔

پھر وہ بولا، ''کیا ژان دلیموؔرا ابھی زندہ ہے؟''

اس کی نظریں میری آنکھوں میں پیوست تھیں اور ان میں اضطراب کا سمندر متلاطم تھا۔

میں مسکرادیا، ''وہ؟۔۔۔ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ حسین ہو گئی ہے۔''

''کیا آپ اسے جانتے ہیں۔''

''ہاں۔''

وہ ایک لمحے کے لئے ہچکچایا اور بولا، ''بہت اچھی طرح؟''

''نہیں۔''

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''مجھے اس کے بارے میں بتائیں۔''

''میں کیا بتا سکتا ہوں؟ سوائے اس کے کہ وہ پیرس کی حسین ترین عورتوں، بلکہ حسین ترین لڑکیوں میں سے ایک ہے۔ سارا شہر اس کے حسن کے سحر میں گرفتار ہے۔ وہ کسی شہزادی کی سی رنگین اور پرآسائش زندگی گزار رہی ہے۔ بس اور کیا بتاؤں؟''

''میں اس سے پیار کرتا ہوں۔'' اس کا لہجہ ایسا ہی تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو، ''میں مر رہا ہوں۔'' وہ بولتا چلا گیا۔

''آہ۔۔۔ تین سال تک ہم بیک وقت خوف اور انبساط کے عالم میں اکٹھے رہے۔ تین

سال میں مَیں نے پانچ چھ مرتبہ اسے قتل کرنے کی کوشش کی۔ایک مرتبہ اس نے یہ بالوں والا کلپ جو ابھی آپ نے دیکھا ہے، میری آنکھوں میں گھونپ دینے کی کوشش کی تھی۔یہ دیکھیں، میری بائیں آنکھ کے نیچے یہ سفید نشان دکھائی دے رہا ہے؟ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔میں آپ کو اس دیوانگی کے بارے میں کیسے سمجھاؤں؟ آپ کبھی نہ سمجھ پائیں گے۔''

''پیار کی ایک تو سیدھی سادی قسم ہوتی ہے جو دودلوں اور دوروحوں کے باہمی جذبات کا نتیجہ ہوتا ہے۔لیکن اس کی ایک اور بھیانک قسم بھی ہوتی ہے جو انتہائی سفّاکی سے اذّیت پہنچاتی ہے۔۔۔جو ایسی دو مختلف شخصیات کے مخفی ملاپ کے نتیجے میں سامنے آتا ہے جو ایک دوسرے سے بیک وقت شدید محبت اور شدید نفرت کرتے ہیں۔''

''اس عورت نے تین سال میں مجھے تباہ وبرباد کر ڈالا۔میرے پاس چالیس لاکھ فرانک تھے جو اس نے بڑے سکون واطمینان سے اڑادئے۔اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ ہوتی جو اس کی آنکھوں سے اس کے ہونٹوں پر اتر آتی۔نجانے آپ میری بات سمجھ رہے ہیں یا نہیں؟اس میں کوئی ایسی کشش تھی جو ناقابلِ برداشت تھی۔وہ کیا تھی؟ مجھے معلوم نہیں۔کیا وہ اس کی سرمئی آنکھیں تھیں جو کسی برمے کی طرح یا کسی تیر کی نوک کی طرح دل میں چھید کر دیتی تھیں؟ نہیں۔۔۔شائد وہ اس کی دھیمی، بے باک اور مسحور کن مسکراہٹ تھی جو وہ کسی نقاب کی طرح ہر وقت پہنے رکھتی تھی۔اس کا مدھر حسن آہستہ آہستہ دیکھنے والے کے رگ وپے میں سرائت کر جاتا اور خوشبو کی طرح معطر کر دیتا۔جب وہ قریب سے گزرتی تو اس کا نرم و نازک بدن دھیرے دھیرے لہراتا۔یوں لگتا کہ وہ زمین پر نہیں ہوامیں تیر رہی ہو۔اس کا چبا چبا کر باتیں کرنا یوں لگتا تھا جیسے اس کی مسکراہٹ کے ساتھ موسیقی ترتیب دی گئی ہو۔اور اس کی حرکات وسکنات اتنی متناسب تھیں کہ اپنے آہنگ سے نظروں کو مسحور کر دیتی۔تین سال تک وہ میرے لئے کائنات کا محور تھی۔تین سال تک اس نے مجھے کتنی اذیّت پہنچائی۔اس نے مجھے بھی ایسے ہی دھوکہ دیا جیسے ہر ایک کو دیتی رہی۔کیوں؟ بلاوجہ!صرف دھوکہ دینے کی لذّت کے لئے۔اور جب مجھے اسکی عیاریوں کا علم ہوا اور میں نے اسے کسی آوارہ بھکارن کی طرح برابھلا کہنا چاہا، تو وہ سکون سے بولی، ''ہم شادی شدہ تو نہیں ہیں!''

''جب سے میں یہاں آیا ہوں میں نے اس کے بارے میں اتنا سوچا ہے کہ بالآخر میں اس کو سمجھ ہی گیا ہوں۔ وہ مجسّم مانوں لیسکو ہے۔ یہ مانوں ہی تھی جو دھو کہ دیئے بنا محبت کر ہی نہ سکتی تھی۔ مانوں جس کے نزدیک محبت، تفریح اور دولت سب ایک ہی چیز ہیں۔''

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ چند لمحوں کے بعد وہ پھر بولا، ''جب میں اپنا آخری فرانک بھی اس پر لٹا بیٹھا تو اس نے مجھ سے کہا، ''سمجھنے کی کوشش کرو میری جان! میں صرف ہوا اور پانی پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں تمہیں بہت چاہتی ہوں۔۔۔ شائد سب سے زیادہ۔۔۔ لیکن مجھے بھی زندہ رہنا ہے۔ میں اور افلاس ایک ہی گھر میں نہیں رہ سکتے''۔''

''کاش میں آپ کو بتا سکتا کہ میں نے اس کے ساتھ کیسی اذیّت ناک زندگی گزاری ہے۔ وہ جب بھی میری نظروں کے سامنے آتی تو مجھے سمجھ نہ آتا کہ اسے چوم لوں یا اسے مار ڈالوں۔ اس پر نظر پڑتے ہی۔۔۔۔ میرے دل میں ایک شدید خواہش پیدا ہوتی کہ اسے اپنی بانہوں میں بھر لوں۔۔۔ اور پھر اس کا گلا گھونٹ دوں۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں کچھ تھا۔۔۔ کوئی غیر محسوس سا فریب جو مجھے اس سے گھِن کھانے پر مجبور کر دیتا۔ اور شائد یہی وجہ تھی کہ میں اس سے اتنا پیار کرتا تھا۔ اس کی لازوال نسوانیت۔۔۔ کراہیت انگیز اور گمراہ کن نسوانیت جتنی اس میں تھی کسی اور عورت میں نہ تھی۔ یہ نسوانیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی جیسے کوئی زہریلا مدہوش کن مشروب۔۔۔ وہ اس حد تک مکمل عورت تھی کہ آج تک کسی نے نہ دیکھی ہو گی۔''

''جب ہم اکٹھے باہر جاتے تو وہ دوسرے مردوں کو یوں دیکھتی جیسے ایک ہی نظر میں خود کو ان کے سپرد کر رہی ہو۔ میں اس بات سے جتنا مشتعل ہوتا اس کے لئے میری چاہت اتنی ہی شدید ہو جاتی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی کہ گلیوں میں چلتے ہوئے۔۔۔ میری موجودگی کے باوجود۔۔۔ اور خود نہ چاہتے ہوئے بھی۔۔۔ صرف اپنی فطرت سے مجبور ہو کر۔۔۔ ہر شخص کی ملکیت تھی۔ حالانکہ چال ڈھال سے وہ انتہائی حیا دار دکھائی دیتی تھی۔ کیا آپ سمجھ رہے ہیں؟''

''اوہ کیسا عذاب تھا! تھیٹر میں، ریستوران میں مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے یوں لگتا تھا کہ وہ کسی اور کی ہو گئی ہے۔ اور میرے جانے کے فوراً بعد وہ واقعی کسی اور کی ہو گئی۔ اس

کو دیکھے اب دس سال ہو چکے ہیں اور میں اس کو پہلے سے بھی زیادہ شدت سے چاہتا ہوں۔"

رات کی سیاہ چادر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ ہوا میں ہر طرف سنگتروں کے درختوں کی خوشبو پھیل چکی تھی۔

میں نے کہا، "کیا آپ اسے پھر ملیں گے؟"

"زمین اور رقم ملا کر میرے پاس کُل قریباً پانچ چھ لاکھ فرانک ہو چکے ہیں۔ جب میرے پاس دس لاکھ فرانک اکٹھے ہو جائیں گے تو میں سب کچھ بیچ کر واپس اس کے پاس چلا جاؤں گا۔ اتنی دولت کے ساتھ میں اس کے ساتھ ایک سال تو گزار سکوں گا۔ پورا ایک سال۔ اور پھر خدا حافظ۔۔۔ میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا، "اور اس کے بعد؟"

وہ چند لمحے مجھے تکتا رہا اور پھر بولا،

"اس کے بعد مجھے معلوم نہیں۔۔۔ بس یہی کچھ ہو گا۔۔۔ ہو سکتا ہے شائد میں اس سے کہوں کہ مجھے اپنے گھر میں نوکر رکھ لے۔"

7

ہیروں کا سیٹ

La Parure

وہ ان حسین و جمیل اور نفیس لڑکیوں میں سے تھی جو شاید قدرت کی غلطی سے کسی نچلے طبقے کے ملازمت پیشہ گھرانے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔اس کے پاس نہ تو جہیز تھا اور نہ ہی کوئی ایسے اسباب جن کی بنا پر وہ جانی جاتی، سمجھی جاتی، چاہی جاتی اور کسی معروف امیر زادے سے بیاہی جاتی۔اس لئے اس کی شادی خاموشی سے محکمۂ تعلیم میں ملازم ایک کلرک سے کر دی گئی۔

اپنے مالی حالات کی بنا پر وہ ہمیشہ سادہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اس کو اپنی کم مائیگی کا احساس گھن کی طرح چاٹے جاتا تھا۔لڑکیوں کا کوئی خاندان کوئی قبیلہ نہیں ہوتا۔ان کا حسن ان کی چال ڈھال اور ان کے ناز و انداز ہی ان کا نام و نسب ہوتا ہے۔ان کی پیدائشی نفاست، فطری شائستگی، اور سمجھ بوجھ ہی ان کا رتبہ و منصب ہوتا ہے۔انہی خوبیوں کی بنا پر ہی غریب لڑکیاں بھی کبھی کبھار امراء اور شرفاء کی خواتین جیسی دکھائی دیتی ہیں۔

لیکن وہ اپنی محرمیاں اندر ہی اندر جھیلتی رہی۔اسے احساس تھا کہ وہ آرام و آسائش سے بھرپور زندگی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔اسے اپنا فرسودہ گھر، ننگی دیواریں، پرانی کرسیاں اور سالہا سال پرانے پردے چبھتے تھے۔یہ ساری چیزیں، جو اس کے سماجی طبقے کی کسی اور عورت کے خواب و گمان میں بھی نہ آتیں، اس کا منہ چڑاتی، تحقیر اور تذلیل کرتی محسوس ہوتی

تھیں۔ اپنے گھر میں کام کاج کرنے والی بریتون کی رہائشی لڑکی پر جب بھی اس کی نظر پڑتی تو اس کے دل میں غربت اور ذلت کا احساس اور بھی شدت سے پھنکارنے لگتا۔ پھر وہ خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی۔ جہاں دبیز قالینوں اور مدھم روشنیوں والے کمرے تھے۔۔۔ کھڑکیوں کے سامنے مخملیں پردے تھے۔۔۔ جہاں بلبوں کے نیچے بھاری پیتل کے لیمپ تھے۔۔۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے دو ملازم تھے جو آتشدان کے گرمی میں اونگھتے دکھائی دیتے۔ وہ مخمل و کمخواب سے آراستہ استقبالیہ کمروں کے بارے میں سوچتی۔۔۔ جہاں کونوں کھدروں میں بھاری بھر کم فرنیچر پر قیمتی نوادرات سجے ہوتے۔۔۔ اور خوشبوؤں سے معطّر اندرونی کمرے ہوتے جہاں دھیمی آواز میں وہ اپنے قریبی دوستوں سے باتیں کیا کرتی۔۔۔ خوبصورت اور نوجوان دوست جن کی صحبت اور قربت کی خواہش مند سارے شہر کی خواتین ہوا کرتیں۔

جب وہ رات کے کھانے پر اپنے شوہر کے سامنے بیٹھتی، میز پر تین دن پرانا دستر خوان بچھا ہوتا اور اس کا شوہر رکاب کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے خوش مزاجی سے کہتا، ''آہ! سبزی گوشت! بھئی یہ تو دنیا کی سب سے لذیذ چیز ہے۔'' تو وہ اپنے خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی، وسیع و عریض کھانے کے کمروں میں۔۔۔ جہاں چاندی کے چمکدار چھری کانٹے ہوتے۔۔۔ جہاں دیواروں پر بڑی بڑی تصاویر آویزاں ہوتیں جن میں پرانے زمانے کے بادشاہوں اور طلسماتی دنیاؤں کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے چینی اور بلوری برتنوں میں پیش کئے گئے پر اشتہا کھانے ہوتے اور جہاں مہمان ایک دوسرے سے خوش گپیاں کرتے اور ساتھ ساتھ تازہ مچھلی اور شکار کیے گئے پرندوں سے لطف اندوز ہوتے۔

اس کے پاس کوئی قیمتی لباس نہ تھا اور نہ ہی کوئی زیورات۔ اسے صرف اسی کا دکھ تھا۔ وہ تو شاید پیدا ہی انہی چیزوں کے لئے ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ اسے بھی لوگ چاہیں۔۔۔ اس کی نظر التفات کے منتظر رہیں۔۔۔ اس کے خواب دیکھیں۔۔۔ اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے بیتاب رہیں۔

اس کی ایک ہی امیر دوست تھی جو سکول میں اس کی ہم جماعت تھی۔ لیکن اپنی اس دوست کو ملنے کے بعد وہ اپنے حالات پر اتنا کڑھتی تھی کہ اب اس نے اس دوست کو ملنا بھی

چھوڑ دیا تھا۔ اپنے کمرے میں وہ کبھی کبھار سارا سارا دن روتی رہتی۔۔۔ اپنی بے بسی پر۔۔۔ اپنی ناامیدی پر۔۔۔ اپنی مایوسی پر اور اپنی مفلسی پر۔ پھر ایک شام اس کا شوہر جب دفتر سے لوٹا تو اس کے چہرے پر ایک چمک اور ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا۔

''دیکھو تو، میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں؟''

اس نے بڑے اشتیاق سے لفافہ کھولا۔۔۔ اندر سے ایک کارڈ نکلا جس پر مندرجہ ذیل تحریر درج تھی، ''جناب وزیرِ تعلیم اور مادام جارج رامپونو موسیو اور مادام لوازیل کو سوموار ۱۸ جنوری کو وزارتِ تعلیم کے دفتر میں ایک عشائیے پر مدعو کرتے ہیں۔''

اس کا شوہر جانتا تھا کہ وہ اس دعوت نامے کو پا کر بہت خوش ہو گی لیکن اس نے کارڈ انتہائی لاتعلقی سے میز پر پھینک دیا۔ اور دھیرے سے بولی، ''تو پھر؟ میں اس کا کیا کروں؟''

''مگر۔۔۔؟؟ میری جان! میں تو سمجھا تھا کہ تم خوش ہو گی؟ تم ویسے تو کبھی باہر نہیں جاتی۔ یہ تو ایک بہترین موقع ہے۔ اور یہ دعوت نامہ میں نے بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے۔ ہر شخص اس دعوت میں مدعو کئے جانے کے لئے بیتاب ہے۔ بڑے لوگ اس کے متلاشی ہیں اور وزارت کے صرف چند ہی ملازمین کو دیا گیا ہے۔ تم دیکھنا! وہاں تمام بڑے بڑے افسران آئے ہوں گے۔''

وہ بیزاری سے اس کو دیکھتی رہی اور پھر درشتی سے بولی، ''اور اس دعوت پر میں پہن کر کیا جاؤں گی؟''

اس کے شوہر نے اس کے بارے میں تو سوچا ہی نہ تھا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا، ''وہ۔۔۔ وہ لباس جو تم تھیٹر جاتے ہوئے پہنتی ہو وہ میرے خیال میں تو بالکل مناسب ہو گا۔ یا پھر۔۔۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ حیرت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس کی بیوی کی جھکی ہوئی پلکوں سے دو موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر گرے اور دھیرے دھیرے اس کی ٹھوڑی کی جانب بہنے لگے۔ وہ رو رہی تھی۔

وہ بمشکل تمام یہی کہہ پایا، ''ک۔۔ ک۔۔۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟''

لیکن اس کی بیوی نے یکا یک خود پر قابو پالیا اور اپنے گالوں سے آنسو پونچھتے ہوئے انتہائی پر سکون اور سپاٹ آواز میں بولی، ''کچھ نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ میرے پاس کپڑے نہیں

ہیں اور اس لئے میں اس دعوت میں نہیں جا سکتی۔ یہ کارڈ اپنے کسی دوست کو دے ڈالو جس کی بیوی کے پاس مجھ سے بہتر کپڑے ہوں۔''

اس کے شوہر کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ بولا، ''اچھا! ماتیلدہ! بتاؤ ایک مناسب لباس جو تم بعد میں دوسرے مواقع پر بھی پہن سکو، کتنے میں آئے گا؟''

اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا کہ اپنے شوہر سے کتنی رقم کا تقاضا کرے۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں اس کا کفایت پسند شوہر صاف انکار ہی نہ کر دے یا پھر کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہو جائے۔ پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولی، ''مجھے صحیح اندازہ تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ چار سو فرانک میں اچھا لباس تیار ہو سکتا ہے۔''

اس کے شوہر کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ اس نے کچھ عرصے سے شکار کے لئے نئی بندوق خریدنے اور آئندہ گرمیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ اُلوؤں کا شکار کھیلنے نانتیر جانے کے لئے چار سو فرانک ہی بچا رکھے تھے۔

وہ بولا، ''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں چار سو فرانک دیتا ہوں۔ تم اپنے لئے ایک عمدہ سا لباس تیار کرا لو۔''

دعوت کا دن قریب آچکا تھا۔ لیکن مسز لوازیل افسردہ، پریشان اور فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔ حالانکہ اس کا لباس تیار ہو چکا تھا۔ ایک شام اس کے شوہر نے پوچھ ہی لیا، ''کیا بات ہے؟ تم پچھلے تین دن سے کچھ پریشان سی دکھائی دیتی ہو؟''

وہ بولی، ''میں اس وجہ سے پریشان ہوں کہ میرے پاس کوئی زیور نہیں ہے۔ پہننے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ زیورات کے بغیر تو اس دعوت پر جانا بہت عجیب لگے گا۔ اس سے تو نہ جانا ہی بہتر ہو گا۔''

وہ بولا، ''تو پھولوں کے گجرے پہن لینا۔ اس موسم میں تو بہت نفیس دکھائی دیتے ہیں۔ پانچ دس فرانک میں تمہیں دو تین بہترین گلاب کے گجرے مل جائیں گے۔''

لیکن اس کی بیوی نہ مانی، ''نہیں۔ اس سے زیادہ بے عزّتی کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ اتنی امیر کبیر عورتوں کے درمیان میں غریبوں کی طرح دکھائی دوں۔''

اس کا شوہر اچانک بول اٹھا، ''ارے تم کیسی بے وقوف ہو! اپنی دوست مسز فوریتیے کے

پاس جاؤاور ایک شام کے لئے اس سے کچھ زیورات ادھار مانگ لو۔وہ تمہاری بہت پرانی دوست ہے۔۔۔اتنا تو ضرور کر سکتی ہے۔''

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔''ارے ہاں۔۔۔یہ ٹھیک ہے۔میں نے اس کے بارے میں تو سوچا ہی نہ تھا۔''

وہ دوسرے ہی دن اپنی دوست کے گھر جا پہنچی اور اس کو اپنی مشکل بیان کر ڈالی۔

مسز فوریستیے اٹھی اپنی الماری کی جانب گئی اس میں سے ایک بکس نکال کر اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ڈھکن اٹھا کر مسز لوازیل سے بولی،''جو پسند آئے چن لو۔''

پہلے وہ ایک کنگن دیکھتی رہی پھر موتیوں کا ایک نیکلیس اور پھر صلیب کی شکل کا ایک ہار جس میں قیمتی پتھر جڑے تھے۔ایک ایک کر کے وہ زیورات پہن کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی۔لیکن جو زیور اس کو پسند نہ بھی آتا اس کو اتارنا اور واپس بکس میں رکھنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔پھر اس نے پوچھا،''اور کچھ نہیں ہے؟''

''ہیں تو! دیکھو تو سہی! مجھے کیا معلوم تمہیں کیا پسند آئے گا؟''

پھر اچانک اس کی نظر سیاہ ساٹن کا ایک بکس دکھائی دی جس میں ہیروں کا ایک سیٹ جھلملا رہا تھا۔اس سیٹ پر نظر پڑتے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔اس کو تھیلی سے نکالتے ہوئے اس کی انگلیاں لرزنے لگیں۔نیکلیس پہن کر وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اس کی آنکھیں خود کو پہچان نہ سکیں۔دھڑکتے دل کے ساتھ وہ مڑی اور پرامید لہجے میں پوچھا، ''کیا میں یہ لے جا سکتی ہوں۔۔۔صرف یہی؟''

''ہاں۔کیوں نہیں!''

اس نے لپک کر اپنی باہیں اپنی دوست کے گلے میں ڈال دیں اور اس کو چوم لیا۔نیکلیس لے کر گھر واپس آتے ہوئے اس کے قدم زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔

دعوت کا دن آن پہنچا۔مسز لوازیل سب لوگوں کی نگاہوں کا مرکز تھی۔وہ خواتین میں سب سے حسین ترین دکھائی دے رہی تھی۔ہنستی، مسکراتی، کھلکھلاتی ہوتی اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔سب مرد مڑ مڑ کر اس کو دیکھتے رہے۔۔۔اس کا نام پوچھتے رہے۔۔۔اس سے ہمکلام ہونے کی کوشش کرتے رہے۔وزارت کے سبھی اعلیٰ افسران اس

کے ساتھ ڈانس کرنا چاہتے تھے۔وزیر تعلیم نے بھی اس کے بارے میں دریافت کیا۔

وہ وارفتگی کے عالم میں ناچتی رہی۔وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔اسے احساس تھا کہ آج اس کا حسن سب پر بازی لے گیا ہے۔ آج اس کی جیت کا دن تھا۔اسے یوں لگا کہ جیسے وہ بادلو ں پر تیر رہی ہے۔ مردوں کی باتیں۔۔۔ عورتوں کی ستائشی نگاہیں۔۔۔ تعریفی کلمات۔۔۔یہی وہ چیزیں تھیں جن سے کسی بھی عورت کی مکمل کامیابی کا احساس کیا جاسکتا ہے۔

صبح چار بجے وہ دعوت سے روانہ ہوئے۔اس کا شوہر تو بارہ بجے رات سے ہی ایک چھوٹے کمرے میں تین اور مردوں کے ساتھ سویا ہوا تھا جن کی بیویاں بھی دعوت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔وزارت کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے اس کے شوہر نے اس کا کوٹ کندھوں پر اوڑھ دیا۔یہ کوٹ پرانا اور بوسیدہ تھا اور دعوت کے لئے بنائے گئے نئے لباس پر یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی نے ریشم پر ٹاٹ رکھ دیا ہو۔اسے اس بات کا احساس تھا اس لئے وہ کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گئی تا کہ اور عورتیں اس کو نہ دیکھ پائیں جن کے کندھے مخملیں پشم دار شالوں اور کوٹوں میں لپٹے ہوئے تھے۔لوازیل نے اس کو روکنے کی کوشش کی، ”ارے ٹھہرو تو سہی! تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔میں ابھی کوئی بگھی تلاش کرتا ہوں۔“لیکن وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے تیز قدموں سے سیڑھیاں اترتی گئی۔سڑکیں ویران پڑی تھیں۔ کبھی کبھار انہیں کوئی بگھی دکھائی دیتی تو وہ اس کو بلانے کے لئے آوازیں دیتے لیکن بے سود۔سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے وہ دریائے سین کے کنارے تک آن پہنچے۔وہاں بالآخر انہیں ایک تانگہ مل ہی گیا۔ایسا تانگہ کبھی دن کے وقت دکھائی نہیں دیا تھا شاید وہ بھی دن کے وقت پیرس میں دکھائی دینے پر نادم ہو۔

اس تانگے میں وہ رُوَدمارتیر پر واقع اپنے گھر آن پہنچے۔دونوں خاموشی سے گھر میں داخل ہوئے۔وہ سوچ رہی تھی کی آج کی دعوت کے بعد اس کی زندگی میں کیا رہ گیا ہے۔اس کا شوہر سوچ رہا تھا کہ چند گھنٹوں بعد اس کو دفتر پہنچنا ہوگا۔

اس نے اپنا اوور کوٹ اتار پھینکا اور آئینے کے سامنے آخری بار خود کو دیکھنے کھڑی ہوئی۔یکایک اس کی چیخ نکل گئی۔اس کی گردن کے گرد ہیروں کا سیٹ موجود نہیں تھا۔

اس کا شوہر جو کپڑے اتار رہا تھا، مڑا اور پوچھا، ''کیا ہوا؟''

وہ اپنے شوہر کی جانب مڑی تو اس کا رنگ فق ہو چکا تھا، ''وہ۔۔۔وہ۔۔۔ مسز فوریستیئے کا ہیروں کا ہار نہیں ہے۔''

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا، ''کیا؟۔۔۔ کیسے؟۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

انہوں نے اس کے نئے لباس میں تلاش کیا۔ اوور کوٹ کی جیبوں میں ڈھونڈا۔ ہر جگہ دیکھا لیکن سیٹ نہ ملا۔

اس کا شوہر بولا، ''کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ دعوت سے نکلتے ہوئے وہ تمہارے پاس ہی تھا؟''

''ہاں۔ ہاں۔ میں نے عمارت سے باہر نکلنے سے پہلے چھو کر دیکھا تھا۔''

''لیکن اگر وہ سڑک پر گرتا تو ہمیں آواز تو سنائی دیتی۔ یہ ضرور بگھی میں ہی گرا ہو گا۔''

''ہاں۔ ہو سکتا ہے۔ تم نے نمبر نوٹ کیا تھا؟''

''نہیں۔ تم نے بھی نہیں دیکھا؟''

''نہیں۔''

وہ دونوں ششدر نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر لوازیل نے دوبارہ کپڑے پہننا شروع کر دیئے۔

''ہم جس راستے سے آئے ہیں میں اس راستے پر دوبارہ جاتا ہوں شائد کہیں پڑا مل جائے۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

وہ اپنے نئے لباس میں ملبوس ایک کرسی میں بیٹھی رہی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ سو ہی جاتی۔ بغیر سوچے سمجھے وہ تاریک اور ٹھنڈے آتشدان کو تکتی رہی۔

اس کا شوہر صبح سات بجے واپس آیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔

پھر وہ پولیس میں رپٹ درج کرانے گیا۔ ڈھونڈنے والے کو انعام دینے کا اعلان کرانے کے لئے اخبار کے دفتر گیا۔ بگھیوں والی کمپنی کے دفتر گیا۔۔۔ ہر اس جگہ گیا جہاں سے امید کی کوئی موہوم سی ٹمٹماتی ہوئی لَو دکھائی دیتی تھی۔ اور وہ اسی حالت میں اسی کرسی

میں سارا دن بیٹھی رہی۔ سارا دن اس کی نگاہیں دروازے پر جمی رہیں۔

شام کے وقت لوازیل واپس لوٹا تو اس کے کندھے جھکے ہوئے اور چہرے کا رنگ پیلا پڑا تھا۔ اسے کچھ نہیں ملا تھا۔

''اپنی دوست کو خط لکھو اور اسے کہو کہ سیٹ کا کنڈا ٹوٹ گیا ہے اور تم نے مرمت کے لئے سنار کو دیا ہے۔ اس سے ہمیں کچھ وقت تو مل جائے گا۔''

اس کا شوہر بولتا رہا اور وہ خط لکھتی رہی۔

ایک ہفتے کے بعد وہ امید کھو بیٹھے تھے۔ اس ایک ہفتے میں یوں دکھائی دیتا تھا کہ لوازیل پانچ سال مزید بوڑھا ہو چکا ہو۔ پھر وہ بولا، ''اب ہمیں نیا سیٹ بنوانے کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔''

دوسرے روز وہ دونوں وہ بکس لے کر اس جوہری کے پاس گئے جس کا نام اس بکس پر کندہ تھا۔ اس نے اپنے کھاتے دیکھے اور بولا، ''مادام، یہ سیٹ تو میں نے نہیں بنایا۔ البتہ بکس ہماری دکان ہی کا ہے۔'' پھر وہ ایک کے بعد دوسرے جوہری کے پاس گئے۔ ہر دکان پر اس جیسا سیٹ تلاش کرتے۔ ہر سیٹ کو دیکھ کر اپنی یادداشت پر زور دیتے۔ پھر پالے روئیآل کے قریب ایک بہت عالیشان دکان میں انہیں ایک ایسا ہیروں کا سیٹ دکھائی دیا جو ان دونوں کے اندازے کے مطابق عین اس سیٹ جیسا تھا جو وہ تلاش کر رہے تھے۔ اس کی قیمت چالیس ہزار فرانک تھی۔ اگر وہ خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو جوہری ان کو چھتیس ہزار فرانک میں دینے پر تیار تھا۔ انہوں نے جوہری سے درخواست کی کہ وہ تین دن تک اس سیٹ کو فروخت نہ کرے۔ جوہری اس شرط پر بھی تیار ہو گیا کہ اگر فروری تک پہلا سیٹ مل گیا تو وہ اپنا سیٹ چونتیس ہزار فرانک میں واپس خرید لے گا۔

لوازیل کے پاس اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے اٹھارہ ہزار فرانک موجود تھے۔ باقی رقم اس نے ادھار لی۔ اس نے ہر جگہ سے ادھار اٹھایا۔۔۔ ہزار فرانک اِدھر سے پانچ سو فرانک اُدھر سے۔۔۔ کچھ اس سے کچھ اُس سے۔۔۔ شہر کے سارے سود خوروں سے ادھار اٹھایا۔ اپنا ہر مال و اسباب گروی رکھ دیا۔ اپنی ساری ہستی ہی گروی رکھ دی۔ ہر اس کاغذ پر دستخط کر ڈالے جس سے اس کو کچھ رقم ادھار مل سکتی تھی یہ جانے بغیر کہ وہ یہ ادھار ادا بھی

کر سکے گا یا نہیں۔ پھر ایک روز اپنے تاریک مستقبل کے وسوسوں اور آنے والی محرومیوں کے بوجھ تلے دبے بھاری قدموں سے چلتے ہوئے جوہری کے کونٹر پر چھتیس ہزار فرانک رکھ کر لوازیل نیا ہیروں کا سیٹ خرید لایا۔

جب مسز لوازیل ہیروں کا سیٹ مسز فوریستیے کو لوٹانے گئی تو اس نے سرد مہری اور بے اعتنائی سے صرف اتنا کہا، ''تمہیں یہ بہت پہلے لوٹا دینا چاہئیے تھا۔ مجھے اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔''لیکن اس نے بکس کھول کر بھی نہ دیکھا۔ مسز لوازیل نے سکھ کا سانس لیا۔ اگر اسے شک ہو جاتا کہ سیٹ تبدیل کیا گیا ہے؟ وہ کیا سوچتی؟ کیا کہتی؟ کیا اس کو چور نہ سمجھتی؟

اس دن کے بعد مسز لوازیل کو اندازہ ہوا کہ در حقیقت غریب کیسی زندگی گزارتے ہیں۔ اس نے انتہائی بہادری سے حالات کا سامنا کیا۔ آخر اس ساری صورتحال کی ذمہ دار وہی تو تھی۔ یہ پہاڑ جیسا ادھار بھی تو اتارنا تھا۔ اس سے جو کچھ بھی ہو سکا وہ ضرور کرے گی۔ اپنے حصے کی صلیب اٹھائے گی۔ سب سے پہلے خادمہ کو فارغ کیا گیا۔ بڑا فلیٹ چھوڑ دیا گیا اور ایک کمرے والا ایک سستا سا گھر کرائے پر لیا گیا۔

گھر کے۔۔۔ باورچی خانے کے سب چھوٹے بڑے کام وہ اپنے ہاتھ سے کرنے لگی۔۔۔ برتن تک خود دھونے لگی۔ اس کی نرم و نازک مخروطی انگلیاں برتنوں سے چکنائی اور دیگچیوں سے کالک اتارتے اتارتے کھردری ہو گئیں۔ ہاتھوں سے کپڑے دھوتی رہی اور انہیں سوکھنے کے لئے تار پر لٹکاتی رہی۔ ہر روز صبح وہ کچرا اٹھائے گلی تک جاتی اور پانی کی بالٹیاں بھر کر اوپر لاتی۔۔۔ ہر منزل پر رک کر سانس لیتی۔ ملازماؤں جیسے کپڑے پہنے ہوئے وہ بازار سودا سلف لینے جاتی۔ بغل میں ٹوکری دابے، سبزی فروش، قصائی اور پنساری، سب کے پاس جاتی اور ایک ایک پیسے کیلئے گھنٹوں بھاؤ تاؤ کرتی۔

ہر ماہ قرض کی اقساط ادا کرنا تھیں۔ کچھ کو ادائیگی کی جاتی، کچھ سے مزید مہلت مانگی جاتی۔ اس کا شوہر، سرکاری نوکری کے بعد شام کو ایک دکاندار کے کھاتے لکھتا۔ اور آدھی رات تک آدھ فرانک فی صفحہ کے حساب سے وثیقے لکھا کرتا۔

زندگی کے دس سال ایسے ہی بیت گئے۔

اور ان دس سال میں انہوں نے قرض کی ایک ایک پائی چکا دی۔ اصل زر، سود، سود

در سو، ایک ایک فرانک واپس کر دیا۔

مسز لوازیل اب ایک ادھیڑ عمر خاتون دکھائی دیتی تھی۔ سب غریب عورتوں کی طرح اب وہ بھی کٹی، سخت جان اور تلخ زبان ہو چکی تھی۔ بلکھے بال، بوسیدہ کپڑے اور سخت کھردرے ہاتھوں کے ساتھ وہ سر عام کپڑے دھوتی اور اونچی کرخت آواز میں دوسری عورتوں سے باتیں کیا کرتی۔ لیکن کبھی کبھار جب اس کا شوہر دفتر ہوتا اور وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہوتی تو کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتی اور اُس ایک شام کے بارے میں سوچنے لگتی جب وہ اتنی حسین اور اتنی مقبول تھی۔

اگر وہ ہیروں کا سیٹ نہ کھو جاتا تو کیا ہوتا؟ کون جانے؟ کون جانے؟ زندگی بھی کتنی عجیب اور ناپائدار ہوتی ہے؟ ایک ہی لمحہ کیسے زندگی کو تباہ کر سکتا ہے اور ایک ہی لمحہ کیسے زندگی کو سنوار بھی سکتا ہے!

ہر اتوار کو وہ اپنے گھریلو کام کاج سے فارغ ہو کر شانزے لیزے جاتی اور وہاں چند لمحوں کے لئے اپنے حالات بھول جانے کی کوشش کرتی۔ ایک اتوار اسے اچانک ایک عورت دکھائی دی جو اپنے بچے کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی۔ وہ مسز فوریستیے تھی! اتنی ہی جوان، اتنی ہی خوبصورت اور اتنی ہی دلفریب۔ مسز لوازیل تذبذب کا شکار ہو گئی۔ کیا اس کو جا کر ملنا چاہیے؟ ہاں۔۔۔ کیوں نہیں! اور اب جب کہ وہ ساری ادائیگی کر چکے ہیں تو اس کو سب کچھ بتا دینے میں کیا حرج ہے۔۔۔ کیوں نہیں؟

وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''صبح بخیر ژاں!''

وہ اس کو پہچان نہ پائی۔ اس کے چہرے پر کچھ ناگواری اور کچھ تحیّر کے تاثرات ابھرے۔۔۔ یہ غریب عورت اس سے یوں بے تکلفی سے بات کر رہی ہے؟ وہ کچھ گڑبڑا سی گئی، ''لیکن۔۔۔ خاتون!۔۔۔ میں تو۔۔۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔''

''نہیں۔۔۔ میں ماتیلدہ لوازیل ہوں۔''

اس کی دوست کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''اوہ!۔۔۔ میری ماتیلدہ!۔۔۔ تم کتنی بدل گئی ہو!''

''ہاں۔ جس دن ہم آخری مرتبہ ملے تھے اس کے بعد سے ہم نے بہت برے دن دیکھے ہیں۔ اور بہت برے حالات! اور۔۔۔ اور یہ سب تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے۔۔۔۔''

''میری وجہ سے؟ لیکن کیسے؟''

''تمہیں یاد ہے میں نے وزیرِ تعلیم کی دعوت پر جانے کے لئے تم سے ہیروں کا ایک سیٹ پہننے کے لئے ادھار لیا تھا؟''

''ہاں۔ یاد ہے۔ تو پھر؟''

''وہ سیٹ مجھ سے کھو گیا تھا۔''

''کیا مطلب کھو گیا تھا؟۔۔۔ وہ تو تم نے مجھے لوٹا دیا تھا۔''

''لیکن میں نے تمہیں ایک اور اسی جیسا نیا سیٹ خرید کر لوٹایا تھا۔ اور اب دس سال ہو چکے ہم اس کی قیمت چکا رہے تھے۔ جانتی ہو یہ کوئی آسان بات نہیں تھی۔ ہمارے پاس تو پہلے ہی کچھ نہ تھا۔۔۔۔ بحر حال اب سب ختم ہو چکا ہے اور میں بالکل خوش ہوں۔''

مسز فوریستیے خاموشی سے اس کا چہرہ تکتی رہی۔

''کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ تم نے میرے ہیروں کے نیکلیس کی جگہ ہیروں کا ایک نیا نیکلیس خرید کر مجھے لوٹایا تھا؟''

''ہاں۔ اور تمہیں معلوم ہی نہ ہوا تھا۔ ہے نا؟ دونوں بالکل ایک جیسے تھے۔''

پھر اس کے ہونٹوں پر ایک فخریہ اور مطمئن مسکراہٹ پھیل گئی۔

مسز فوریستیے چہرے پر عجیب سے تاثرات لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی دوست کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''اوہ ماتیلدہ! میرا سیٹ تو نقلی تھا۔ اس کی قیمت تو صرف پانچ سو فرانک تھی۔۔۔!''

8

سودا

L'Aveu

سورج کی تیز دھوپ سے کھیت چمک رہے ہیں۔ تاحدِ نگاہ کھیت ہی کھیت ہیں، کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ گلدستوں کی مانند دکھائی دے رہے ہیں۔ گندم کے کھیتوں پر جیسے سونے کا پانی چڑھا ہو، ترفل کے گہرے سبز اور جئی کے ہلکے سبز رنگ کے کھیت لہلہاتے ہوئے یوں دکھائی دے رہے ہیں جیسے زمین کے ننگے پیٹ پر کسی نے سبز، مہندی اور سنہرے رنگ کی چادر سی بچھا دی ہو۔

دور ایک ٹیلے کی چوٹی پر لاتعداد گائیں ایک قطار میں سپاہیوں کی طرح کھڑی اور بیٹھی ہیں۔ تیز دھوپ کی تاب نہ لاتے ہوئے بڑی بڑی آنکھیں جھپکاتی ہوئی اپنی سوچوں میں گم گھاس چرنے میں مصروف ہیں جو ان کے سامنے کسی جھیل کی سطح کی مانند پھیلی ہے۔

ایک ٹیلے کے عقب سے دو عورتیں۔۔۔ ماں اور بیٹی۔۔۔ آگے پیچھے کھیتوں کے درمیان تنگ پگڈنڈی پر نمودار ہوتی ہیں۔ دونوں کے کندھوں سے ایک بانس کے ساتھ دو جستی بالٹیاں لٹک رہی ہیں۔ ان کے ہر ایک قدم کے ساتھ ہی بالٹیوں کی چمکدار سطح سے سورج کی منعکس ہوتی ہوئی شعائیں آنکھیں چندھیائے دے رہی ہیں۔

وہ دونوں خاموش ہیں۔ وہ دودھ دوہنے جا رہی ہیں۔ گائیوں کے پاس پہنچتے ہوئے انہوں

نے بالٹیاں زمین پر رکھ دیں۔ قریب ترین گائیوں کی پسلیوں میں ایک ٹھڈا رسید کرنے پر دونوں گائیں بدک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پہلے اگلی ٹانگوں پر اور پھر قدرے وقت کے ساتھ پچھلی ٹانگوں پر جیسے دودھ سے بھرے ہوئے تھان اٹھانے میں مشکل پیش آرہی ہو۔ دونوں عورتیں، ماں اور بیٹی، گائیوں کی پیٹ کے ساتھ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئیں۔ دونوں تیزی سے ہاتھ چلانے لگیں اور دودھ کی پتلی دھاریں بالٹیوں میں گرنے لگیں۔ دودھ کی جھاگ کی سطح آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔ دونوں عورتیں ایک کے بعد دوسری گائے کے پاس جاتی رہیں۔ ایک گائے کا دودھ دوہنے کے بعد وہ اس کو گھاس کی جانب دھکیل دیتی تھیں۔ پھر وہ واپس چل دیں۔ لیکن اب ان کی چال میں وہ پہلے والی پھرتی نہیں تھی۔ دودھ سے بھری بالٹیوں کے وزن سے اب وہ دونوں دھیرے دھیرے نپے تلے قدموں سے چلتی جارہی ہیں۔۔۔ آگے ماں اور پیچھے بیٹی۔

پھر یکا یک نوجوان لڑکی رک گئی، بالٹی زمین پر رکھ دی اور زمین پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماں چند قدم تو چلتی رہی پھر بیٹی کے قدموں کی چاپ نہ سن کر رکی، مڑی اور اپنی بیٹی کو زمین پر بیٹھا روتے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ ''کیا ہوا؟''

اسکی بیٹی، سیلیسٹ، سرخ بالوں اور گلابی گالوں والی صحت مند ہٹی کٹی لڑکی، کسی تھکے ہارے بچے کے مانند سسکیاں لیتے ہوئے بولی، ''مجھ سے دودھ نہیں اٹھایا جاتا۔''

اس کی ماں چند لمحوں تک اس کو مشکوک نگاہوں سے تکتی رہی اور پھر دوبارہ بولی، '' کیا ہوا؟''

اس کی بیٹی دونوں بالٹیوں کے درمیان بیٹھی اپنا منہ اپنے ایپرن سے چھپائے بولی، ''یہ بہت بھاری ہیں۔ مجھ سے نہیں اٹھائی جاتی۔''

ماں نے تیسری مرتبہ وہی سوال پوچھا، ''کیا ہوا؟''

کھیت میں چند لمحوں تک سناٹا چھایا رہا۔ پھر اس کی بیٹی نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا، ''میرے بچہ ہونے والا ہے۔'' پھر وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

اس کی ماں نے اپنی بالٹیاں احتیاط سے زمین پر رکھ دیں۔ کچھ دیر وہ اس کو ہکا بکا کھڑی خاموشی سے دیکھتی رہی۔ پھر ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس کے منہ سے نکلے، ''تم

۔۔۔تم۔۔۔ تمہارے بچہ۔۔۔بچہ ہونے کو ہے؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے، بدبخت؟''
یہ یقیناً مالیوڈآر کے زمینداروں میں سے کسی کا کام ہو گا۔ وہ بڑی جاگیروں، مال و دولت اور اثر و رسوخ والے لوگ تھے۔

سلیسٹ ہکلاتے ہوئے بولی، ''ہو گیا ہے بس۔'' اس کی ماں کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ زمین پر بیٹھی اپنی روتی اور منہ بسورتی بیٹی کو دیکھتی رہی۔ پھر یکایک وہ چلا اٹھی، ''تیرے بچہ ہونے کو ہے؟ تیرے بچہ ہونے کو ہے؟ ارے یہ کیسے ہوا اور کہاں ہوا، بدذات؟''

''شائد پولیٹ کی بگھی میں۔''

اس کی ماں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کی بیٹی پر یہ ظلم کس نے ڈھایا ہے۔ اگر کوئی امیر اور خاندانی شخص ہوا تو معاملہ طے کیا جا سکتا ہے۔۔۔حالات سدھر سکتے ہیں۔ سلیسٹ پہلی لڑکی نہیں تھی جس کے ساتھ ایسا ہوا۔ لیکن پھر بھی بیٹھے بٹھائے مشکل تو آن پڑی تھی۔

''اور وہ کون منحوس تھا جس کے ساتھ تو نے منہ کالا کیا؟''

سلیسٹ سب کچھ بتا ڈالنے پر تلی بیٹھی تھی، ''شائد پولیٹ ہی تھا۔''

ماں کے اندر کھولتا ہوا جوالا مکھی تو جیسے پھوٹ پڑنے پر تیار پڑا تھا۔ وہ اپنی بیٹی پر پل پڑی اور دونوں ہاتھوں سے اس پر دوہتڑ برسانے لگی۔ حملہ اس قدر شدید تھا کہ خود ماں کا کنٹوپ اتر گیا اور اس کے بال بکھر گئے۔ وہ اندھا دھند سلیسٹ پر وار کئے جا رہی تھی۔۔۔ سر پر ۔۔۔ کندھوں پر۔۔۔اور سلیسٹ جو کہ اب تک اپنی دونوں بالٹیوں کے درمیان گری پڑی تھی۔۔۔صرف اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپائے ہوئے تھی۔ دودھ بھری بالٹیوں ہی کی بدولت وہ اپنی ماں کے حملے کی پوری شدّت سے کسی حد تک محفوظ بھی رہی۔

قریب چرتی ہوئی گائیں اپنے سر موڑے حیرت زدہ پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک تھوتھنی ان دونوں کی جانب اٹھاتے ہوئے ڈکرائی۔

ماں کچھ ہی دیر میں اپنی بیٹی کو پیٹتے پیٹتے ہانپنے لگی اور اس کی سانس پھول گئی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی اس کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ جب اس کے حواس قابو میں آئے تو اس نے ساری صورتحال سمجھنے کی کوشش کی۔

''پولیٹ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک گھوڑا گاڑی چلانے والا کوچوان؟ کہیں تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ تیری قسمت میں کیا وہی نکما لفنگا ہی لکھا تھا؟''

زمین پر گری ہوئی سیلیسٹ کے چہرے کو چھپائے ہوئے ہاتھوں کے پیچھے سے آواز آئی، ''وہ مجھ سے کرایہ نہیں لیتا تھا۔''

اور اس کی ماں سمجھ گئی۔

بدھ اور ہفتے کے روز سیلیسٹ مرغیاں، مکھن، بالائی اور انڈے گاؤں کے بازار میں بیچنے جاتی تھی۔ صبح سات بجے وہ گھر سے لدی پھندی چلتی تو اس کے ایک بازو میں مرغیوں کی ٹوکری اور دوسرے میں انڈوں اور مکھن بالائی کی ٹوکری ہوا کرتی۔ گھر سے کچھ دور کچی سڑک پر وہ ایوطوط سے چلنے والی گھوڑا گاڑی کا انتظار کرتی۔ ٹوکریاں زمین پر رکھ کے وہ خود گھاس پر دھرنا مار کر بیٹھ رہتی۔ بید کی ٹوکری کے سوراخوں میں سے پتلی نوکدار چونچ والی مرغیاں اور چوڑی گول چونچ والی بطخیں گردنیں باہر نکالے اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے حیرت اور حماقت سے ادھر ادھر دیکھتی تھیں۔ پھر دور سے گھوڑا گاڑی آتی دکھائی دیتی۔ گھوڑا گاڑی کیا تھی بس لکڑی کے ایک بڑے سے پیلے رنگ کے بکس میں دو بانس اور دو پہیئے نصب تھے اور جس کے اوپر کالے ترپال کی چھت۔ ایک مریل سی سفید گھوڑی بمشکل تمام اس کو کھینچ پاتی۔

پولیٹ نامی کوچوان، گو نوجوان تھا لیکن پھر بھی بڑی توند، لال سرخ چہرہ اور ہر وقت ٹھٹھہ مخول کرنے کے شوق کے باعث اپنی عمر سے کہیں بڑا دکھائی دیتا تھا۔ دھوپ، تیز ہوا، برف اور شراب نے اس کی کھال کو اس قدر جھلسا ڈالا تھا کہ اس کے چہرے اور گردن کا رنگ بھٹی میں تپی ہوئی اینٹوں جیسا ہو چکا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی وہ اپنا چابک چٹخاتے ہوئے دور سے چلاتا، ''صبح بخیر، سیلیسٹ! کیسی ہو؟''

وہ اس کو اپنی ٹوکریاں تھماتی اور وہ ایک ایک کر کے ان دونوں کے لئے جگہ بناتا۔ پھر وہ اپنا گھاگرا سنبھالتی ہوئی اونچے پائیدان پر پیر رکھنے کے لئے پاؤں اوپر اٹھاتی تو کبھی کبھار اس کی سرخ و سفید موٹی تازی پنڈلی کی ایک جھلک بھی دکھائی دے جاتی۔ اور ہر مرتبہ پولیٹ ایک ہی بات کہتا، ''ٹھیک ہے بھئی! صحت تو بالکل ٹھیک ہے۔'' وہ جھینپ کر ہنسنے لگتی۔ پھر وہ ''ٹخ ٹخ چل کو کو!'' کہتا اور بوڑھی گھوڑی تھکی ہاری چال سے چلنے لگتی۔ سیلیسٹ اپنے گھاگرے کی

جیب سے پیسوں والی تھیلی نکالتی اور احتیاط سے دس آنے گن کر پولیّا کے کندھے کے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر اس کو تھماتی۔ چھ آنے اپنے اور چار آنے ٹوکریوں کے۔ پیسے وصول کرتے ہوئے پولیّا ہمیشہ کہتا، ''پھر آج کوئی شغل میلہ ہو جائے؟'' پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنستا اور مڑ کر اس کا تفصیلی جائزہ لیتا۔

سیلیسؔط کو تین کلومیٹر کے فاصلے کے لئے یہ آدھا فرانک بہت کھلتا تھا۔ اور جب اس کے پاس کھلے پیسے نہ ہوتے تو پورا ایک فرانک دیتے ہوئے اس کو اور بھی تکلیف ہوتی۔ ایک روز پیسے دیتے ہوئے وہ بولی، ''مجھ جیسی پکی سواری سے تو تمہیں چھ آنے لینے چاہئیں۔''

وہ ہنسنے لگا، ''چھ آنے، میری جان، تمہارے لئے تو چھ آنے کچھ بھی نہیں ہیں۔''

وہ پھر بولی، ''میں تمہیں ہر مہینے دو فرانک دیتی ہوں۔''

وہ اس کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا، ''چلو، کچھ شغل میلہ ہو جائے تو میں یہ بھی نہ لوں گا۔''

اس نے بھولپن سے پوچھا، ''یہ شغل میلہ کیا ہوتا ہے؟''

وہ اتنی زور سے ہنسا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی، پھر بولا، ''شغل میلہ؟ یہ شغل میلہ ہوتا ہے پگلی۔۔۔ شغل میلہ۔۔۔ لڑکی اور لڑکا کرتے ہیں۔ جیسے ناچ ہوتا ہے لیکن گانے بجانے کے بغیر۔''

وہ سمجھ گئی اور جھینپتے ہوئے بولی، ''میں ویسی لڑکی نہیں ہوں۔''

لیکن اسے شرم نہ آئی اور ڈھٹائی سے بولا، ''کبھی تو راضی ہو جاؤ گی میری جان۔ شغل میلہ کریں گے ہم دونوں۔''

اس دن کے بعد جب بھی وہ اس کو کرایہ دیتی تو وہ کہتا، ''پھر؟ آج شغل میلہ ہو گا یا نہیں؟''

اب وہ بھی ہنستی اور کہتی، ''نہیں۔ آج نہیں۔ ہفتے والے دن۔''

وہ کھلکھلا کر ہنستا اور زور سے کہتا، ''ٹھیک ہے تو پھر ہفتے والے دن سہی۔''

وہ دل ہی دل میں حساب لگاتی رہتی، دو سال ہوئے جب سے یہ کھیل شروع ہوا تھا تو وہ اس کو اڑتالیس فرانک دے چکی تھی اور ان کے گاؤں میں اڑتالیس فرانک اچھی خاصی رقم ہوا

کرتی تھی۔اور اس نے مزید حساب لگایا کہ آئندہ دو سالوں میں وہ اس کو تقریباً ایک سو فرانک دے چکی ہو گی۔وہ اپنے حساب کی اتنی پکی تھی کی ایک دن، بہار کے موسم میں، جب وہ دونوں گھوڑا گاڑی میں اکیلے تھے اور پولیؔط نے حسبِ معمول اس سے پوچھا، ''پھر؟ آج شغل میلہ ہو گا یا نہیں؟'' تو اس نے جواب میں کہا، ''جیسے تمہاری مرضی۔''

پولیؔط نے فوراً باگیں چھوڑ دیں اور آگے والا تختہ پھلانگ کر پیچھے آن کودا۔اس کے پاس آ کر وہ دھیرے سے بولا، ''دیکھا! میں نہ کہتا تھا کہ کبھی نہ کبھی ہم راضی ہو ہی جائیں گے۔'' بوڑھی گھوڑی اپنی تھکی ہاری چال سے یوں چلتی رہی جیسے ایک ہی جگہ کھڑے ہوئے ناچ رہی ہو۔اسے شاید وہ آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی وہ وقفے وقفے سے گھوڑا گاڑی کے عقب سے بلند ہوتی، ''ٹخ ٹخ، چل کو کو!'' تین ماہ بعد سیلیسؔط کو احساس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

رندھی ہوئی آواز سے یہ ساری کہانی اس نے اپنی ماں کو سنا ڈالی۔اسکی ماں جس کا چہرہ اب تک غصے سے سفید ہو چکا تھا بولی، ''اب تک کتنے پیسے بچا چکی ہو؟''

''چار مہینے میں پورے آٹھ فرانک۔''

کسان کی بیوی کا غیض و غضب پھر سے پھٹ پڑا اور وہ پھر سے اپنی بیٹی پر پل پڑی۔وہ اس کو اس وقت تک پیٹتی رہی جب تک اس کا سانس پھر سے پھول نہ گیا۔پھر اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے وہ بولی، ''کیا تم نے اسے بتایا کہ تمہارے بچہ ہونے والا ہے؟''

''نہیں۔''

''کیوں نہیں بتایا؟''

''اس لئے کہ کہیں وہ پھر سے کرایہ نہ مانگنے لگے۔''

بوڑھی ماں کچھ دیر سوچتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے بالٹیاں اٹھاتے ہوئے بولی، ''چلو اٹھو، اور چلنے کی کوشش کرو۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ماں پھر بولی، ''اور جب تک وہ خود نہ سمجھ جائے تم اسے کچھ مت بتانا۔شاید اسی طرح پانچ چھ مہینے اور گزر جائیں۔''

سوجی ہوئی آنکھوں، بکھرے بال، بھیگے ہوئے گالوں کے ساتھ سیلیسؔط اٹھ کھڑی ہوئی اور بھاری قدموں کے ساتھ اپنی ماں کے پیچھے چل دی۔پھر اس کی آواز سنائی دی، ''میں بھلا کیوں بتانے لگی؟ میں پاگل ہوں کیا؟''

9

باپ

Le pere

ا

وہ محکمہِ تعلیم میں کلرک تھااور باتنیوؔل کے مضافاتی علاقے میں رہتا تھا۔ ہر روز صبح وہ بس میں بیٹھ کر پیرسؔ آتا۔ ہر روز بس میں اس کے سامنے ایک لڑکی بیٹھا کرتی۔ نجانے کب اسے اس لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔

وہ کسی دکان میں کام کرتی تھی اور روز مقررہ وقت پر اپنے کام پر پہنچ جاتی۔ وہ ایک نازک سی کالے سیاہ بالوں والی لڑکی تھی جس کی آنکھیں اتنی سیاہ تھیں کہ اس کے دودھیا سفید چہرے پر جیسے کسی نے کالک کے دوداغ لگادیئے ہوں۔ وہ روزانہ اپنی گلی کے کونے سے مڑتی دکھائی دیتی اور عموماً اس کو بس پکڑنے کے لئے بھاگنا پڑتا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگتی ہوئی، پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اچک کر بس چلنے سے پہلے اس پر سوار ہو جاتی۔ اپنی سانسوں پر قابو پاتی ہوئی وہ اپنے لئے جگہ ڈھونڈتی اور بیٹھنے کے بعد اپنے ارد گرد نظر دوڑاتی۔ پہلی مرتبہ جب فرانسو اتیسؔئے نے اس کو دیکھا تھا تو پہلی ہی نظر میں ہی وہ اس کے چہرے میں کھو گیا تھا۔ ہر مرد کو کبھی کبھار کہیں نہ کہیں کوئی ایک ایسی لڑکی ضرور دکھائی دیتی ہے جسے جانے پہچانے بنا دیکھتے ہی بانہوں میں بھر لینے کو جی چاہتا ہے۔ اس لڑکی نے بھی اس کے

دل میں کوئی ایسا تار چھیڑ دیا تھا کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا اس شدّت سے کہ اسے خود بھی احساس نہ تھا۔

لڑکی کو یہ احساس ہی نہ ہوا کہ وہ کس بری طرح اس کو تکے جا رہا تھا حتیٰ کہ وہ جھینپ گئی اور اس کے گالوں پر سرخی پھیل گئی۔ وہ خود چونک گیا اور پھر فوراً دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نجانے کب، ہر چند لمحوں بعد اس کی نگاہیں ایک مرتبہ پھر خود بخود اس کے چہرے پر جا کر ٹک جاتیں۔ کچھ دنوں بعد وہ دونوں کچھ کہے بنا ایک دوسرے کو جان چکے تھے۔ جب بس میں ہجوم ہوتا تو وہ خود کھڑا ہو جاتا اور اس کو اپنی نشست پیش کر دیتا۔ اب تو وہ اس کو دیکھتے ہی دھیرے سے مسکرا بھی دیتی۔ لیکن اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ اب بھی اپنی آنکھیں جھکا لیتی۔ لیکن وہ جان چکا تھا کہ وہ اس کی نگاہوں کا برا نہیں مناتی۔

ایک روز ان کی بات چیت ہو گئی۔ پھر ان دونوں کے درمیان ایک دوستی پیدا ہونے لگی۔ آدھ گھنٹہ روزانہ کی دوستی۔۔۔ فرانسوآ کی زندگی کا سب سے سحر انگیز آدھ گھنٹہ۔ باقی سارا دن وہ اسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ دفتر میں بھی اکتا ڈالنے والی لمبی دوپہروں کے دوران اس کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا۔ اس کا چہرہ کسی آسیب کی طرح ۔۔۔ کسی فسوں کی طرح ہر وقت اس کے خیالات پر قابض رہتا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ جس دن وہ اس کی ہو گئی تو اس دن وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ اتنی خوشی کسی بھی انسان کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ پھر وہ روزانہ صبح ہاتھ ملانے لگے۔ سارا دن وہ اپنے ہاتھ میں اس کے ہاتھ کا نرم و ریشمی لمس محسوس کرتا رہتا۔ اس کے ہاتھ کی حدّت، اور اس کی انگلیوں کا نازک دباؤ۔ کئی بار وہ نجانے کتنی دیر اپنے ہاتھ کو بغور دیکھتا رہتا کہ کہیں اس کے ہاتھ کا کوئی نشان تو نہیں رہ گیا۔ وہ دن رات اس آدھ گھنٹے کی ملاقات کے انتظار میں گزار دیتا۔ اتوار کی چھٹی تو گویا گزارے نہ گزرتی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بھی اسے چاہتی تھی کیونکہ بہار کے ایک ہفتے کے روز اس نے میزاں لافیط میں پکنک پر جانے کے لئے حامی بھر لی۔

۲

وہ اسے وقت سے پہلے ہی سٹیشن پر منتظر کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کہنے لگی، ''جانے سے پہلے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ گاڑی چھوٹنے میں صرف بیس منٹ باقی ہیں لیکن مجھے جو کچھ کہنا ہے اس کے لئے اتنا وقت ہی بہت ہے۔''

بولتے بولتے وہ یکایک کانپنے لگی۔ پھر اس نے فرانسوآ کا بازو تھام لیا اور جھکی ہوئی آنکھوں اور زرد رنگت کے ساتھ وہ بولتی گئی۔ ''میں نہیں چاہتی کی آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہوں۔ میں آپ کے ساتھ پکنک پر اس وقت تک نہیں جا سکتی جب تک آپ وعدہ نہ کریں کہ آپ کوئی۔۔۔ آپ کوئی۔۔۔ کوئی غیر شریفانہ حرکت نہیں کریں گے۔'' پھر اس کے رخسار لال سرخ ہو گئے اور وہ خاموش ہو گئی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ بیک وقت خوشی اور مایوسی کے احساسات میں کھو گیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔ لیکن پھر بھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ وہ ساری رات آج کے بارے میں سہانے سپنے دیکھتا رہا تھا۔ گو اسے آج کل کی تیز طرّار لڑکیاں پسند نہیں تھیں لیکن اگر۔۔۔ اگر صرف۔۔۔ کتنا اچھا ہوتا۔۔۔ جیسے کوئی خواب حقیقت میں ڈھل جائے۔ پیار کے معاملے میں اس نے بھی سب مردوں کی مانند طرح طرح کے منصوبے بنا رکھے تھے اور محبت کی آگ ساری رات اس کے روئیں روئیں کو جھلساتی رہی تھی۔

اس کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر کپکپاتی ہوئی آواز سے بولنے لگی۔ اس کی پلکیں بھیگ چکی تھیں۔ ''اگر آپ وعدہ نہیں کریں گے تو میں واپس گھر لوٹ جاؤں گی۔''

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا کانپتا ہوا ہاتھ تھاما اور بولا، ''میں وعدہ کرتا ہوں۔۔۔ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں ہو گی۔''

اسکے چہرہ چمک اٹھا اور وہ مسکراتے ہوئی بولی، ''واقعی؟ کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور بولا، ''میں قسم کھاتا ہوں۔''

''چلیں۔ تو پھر ٹکٹ خریدیں؟''

گاڑی میں انہیں بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ بوگی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

میزاں لافیط پہنچ کر وہ دونوں دریائے سین کی جانب چل دیئے۔ تازہ ہوا کی تمازت نے ان پر ایک عجیب سا خمار طاری کر دیا۔ دریا کے پانی، درختوں کے پتوں اور گھاس کی پتیوں پر چمکنے والی دھوپ نے ان کے دل و دماغ پر سرور کے لشکارے بھر دیئے۔ وہ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے دریا کے کنارے چلتے رہے۔ مچھلیوں کے جھنڈ لہروں کے ساتھ ساتھ پانی میں تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔ خوشی کے اس عالم میں وہ چلتے گئے اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زمین پر نہیں ہوا پر چل رہے ہوں۔ پھر وہ بولی۔

''آپ تو مجھے بے وقوف سمجھتے ہوں گے؟''

''کیوں؟''

''یوں کسی کے ساتھ اکیلے چلے آنا بے وقوفی ہی تو ہے!''

''ارے نہیں تو! یہ تو عام سی بات ہے۔''

''نہیں! یہ عام بات نہیں ہے۔ میرے لئے نہیں۔ کیونکہ میں دھوکہ نہیں کھانا چاہتی۔ بہت سی لڑکیاں ایسے ہی دھوکہ کھا جاتی ہیں۔ لیکن آپ کو کیا معلوم! زندگی کتنی بیزار کن ہے۔ ہر روز وہی معمول۔ مہینے کے سارے دن، سال کے سارے مہینے، میں اپنی ماں کے ساتھ اکیلی رہتی ہوں۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت دکھ جھیلے ہیں۔ اب وہ ہمیشہ افسردہ ہی رہتی ہے۔ میں خوش رہنے کی کوشش تو کرتی ہوں۔ ہنسنے کھیلنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن بس کبھی کبھار ہی کامیاب ہو پاتی ہوں۔ بہر حال، یہاں آنا ٹھیک نہیں تھا۔ چلیں کم از کم آپ تو مجھ سے خفا نہیں ہوں گے۔''

جواب دینے کے بجائے اس نے اچانک جھک کر اس کے کان کو چوم لیا۔ لیکن وہ یکا یک اس کا ہاتھ جھٹک کر اس سے علیحدہ ہو گئی۔ اور پھر ناگواری کے عالم میں کہنے لگی، ''فرانسوا! آپ نے قسم کھائی تھی؟''

وہ واپس میزاں لافیط لوٹ آئے۔ پتی آور میں دریا کے کنارے چار بڑے درختوں کے درمیان تقریباً چھپے ہوئے ایک پرانے مکان میں واقع ریستوران میں انہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھلی آب و ہوا، دھوپ کی تمازت، سفید شراب اور ایک دوسرے کی قربت نے دونوں کو خاموش کر دیا تھا۔ ان کے چہرے حدت سے تمتما رہے تھے۔ لیکن کافی کے ایک

ایک پیالے نے ان کی سستی دور کر دی اور وہ دریا کے دوسرے کنارے پر واقع لافریٹ نامی گاؤں کی جانب چلدیئے۔ وہ اچانک بولا، ''آپ کا نام کیا ہے؟'' ''لوئیس!'' اس نے ایک بار اس کا نام دہرایا اور پھر خاموش ہو گیا۔

یہاں دریا نے ایک لمبا موڑ لیا۔ دور سفید رنگ کے چند مکانات کے سامنے سے دریا گزرتا گیا۔ دریا کے دھیرے دھیرے بہتے پانی میں مکانوں کا عکس الٹا دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکی نے ڈیزی کے پھول چنے اور ایک گلدستہ بنایا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور اونچی آواز میں گاتا رہا۔ دریا کے کنارے بائیں جانب انگور کے باغات تھے۔ پھر اچانک فرانسوا ٹھٹھک کر رک گیا اور بولا، ''اوہ! وہ دیکھیں!'' انگور کے باغات ختم ہو چکے تھے اور سارے میدان میں تاحدِ نظر بنفشی رنگ کے پھول ہی پھول دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے کسی نے ساری زمین پر بنفشی رنگ کا قالین بچھا رکھا ہو۔ افق پر تین چار میل دور ایک گاؤں تک ساری زمین بنفشی رنگ میں رنگی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی رک گئی اور اس منظر کے حسن میں مسحور ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں سے صرف ایک لفظ نکلا، ''اوہ میرے خدا!''۔ ایک کھیت میں سے گزرتے ہوئے وہ بنفشی پھولوں کے اس قالین پر جا پہنچے۔ ہر روز اسی کھیت سے پیرس شہر کو گلِ یاس مہیا کئے جاتے تھے۔ گھنے سایہ دار درختوں کے درمیان ایک پگڈنڈی گزر رہی تھی۔ وہ اس پر چلنے لگے اور کچھ دیر بعد گھنی چھاؤں میں ایک پرسکون جگہ پر بیٹھ گئے۔ ان کے ارد گرد بھنورے اور تتلیاں اڑی پھرتی تھیں۔ فضا میں ایک دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ پھیلی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اور ان کے چاروں جانب پھولوں کے کھیت کی بھینی بھینی خوشبو ان کو مست کئے دیتی تھی۔ دور کہیں کسی گرجا گھر کے گھنٹے کی آواز آئی۔

وہیں درختوں کی چھاؤں میں گھاس پر لیٹے ہوئے وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں آگئے۔۔۔ ایک دوسرے کے سوا کائنات میں اور کچھ نہ رہا۔۔۔ وہ آنکھیں بند کئے اس کی بانہوں میں کھو گئی۔۔۔ بغیر سوچے۔۔۔ بغیر سمجھے دیوانوں کی طرح اس سے لپٹ گئی۔ سر سے پاؤں تک ان چند لمحوں کی مسرّت میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر ڈالا یہ جانے بنا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔۔۔ یہ سمجھے بنا کہ وہ اپنا سب کچھ اس کو دے چکی ہے۔

پھر جب وہ ہوش میں آئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے آنسو چھلک پڑے اور وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

فرانسوآ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن وہ فوراً واپس جانے پر مصر رہی۔ واپسی کے دوران وہ لمبے لمبے قدم بھرتی ہوئی چلتی جاتی اور ساتھ ساتھ یہ کہتی جاتی، ''میرے خدا! میرے خدا!'' وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا، ''لوئیس! لوئیس! ذرا ایک لمحے کے لئے رکیں تو!'' لیکن اب تک اس کی آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں اور رخسار سرخ ہو چکے تھے۔ پیرس کے ریلوے سٹیشن پر اترتے ہی وہ تیزی سے اپنے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔ اسے خدا حافظ کہے بغیر۔

۳

دوسری صبح وہ اسے بس میں بدلی ہوئی دکھائی دی۔۔۔ لاغر سی۔ اس کے قریب آتے ہی وہ بولی، ''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ ہم اگلے سٹاپ پر اتر جائیں گے۔'' فٹ پاتھ پر وہ جونہی اکیلے ہوئے، وہ بولی، ''اب ہم ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد میں آپ سے نہیں مل سکتی۔''

''لیکن کیوں؟''

''اس لئے کہ میں آپ سے نہیں مل سکتی۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں مزید غلطی نہیں کر سکتی۔''

اس نے بہت منت سماجت کی، بھیک مانگی، وہ اسے ہمیشہ کے لئے حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ اس کے ساتھ پیار بھرے دن اور پیار بھری راتیں گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا، ''نہیں۔ میں نہیں مل سکتی۔ میں نہیں مل سکتی۔''

وہ جذبات کی رو میں بہتا گیا۔ پھر اس نے اس سے شادی کرنے کی پیشکش کر ڈالی۔ اس کے جواب میں ایک ہی لفظ بولا، ''نہیں۔'' اور پھر وہ چلی گئی۔

اگلے آٹھ دن وہ دکھائی نہ دی، نہ ہی وہ اس کو مل پایا۔ چونکہ وہ اس کا پتہ نہیں جانتا تھا

اس لئے اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو چکی ہے۔ نویں روز شام کو اس کے گھر کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس کی بانہوں میں آن گری۔ آج اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

تین ماہ تک وہ اس کے ساتھ رہی۔ پھر جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے تو اس کی محبت بیزاری کی شکل اختیار کرنے لگی۔ اب اس کے ذہن میں ایک ہی بات گھومنے لگی۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ لیکن کیسے؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کیا کرے؟ کیا کہے؟ اسے اس ہونے والے بچے سے خوف آنے لگا تھا۔ پھر ایک دن اس نے فیصلہ کرلیا۔ اس رات اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور اس گھر سے فرار ہو گیا۔

وہ اس صدمے سے اس قدر حواس باختہ ہوئی کہ اس نے فرانسوآ کو ڈھونڈنے کی کوشش تک نہیں کی۔ وہ سیدھی اپنی ماں کے قدموں میں جا گری۔ چند ماہ بعد اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔

۴

سال کے بعد سال گزرنے لگے۔ فراسوآتیئے کی زندگی کے سال بھی گزرتے رہے لیکن اس کے معمول میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ ایک سرکاری ملازم کی یکسانیت اور بیزاریت بھری زندگی گزارتا رہا۔ بغیر کسی امید اور بغیر کسی منزل کے۔ ہر روز وہ ایک ہی وقت پر اٹھتا، انہی گلیوں سے گزرتا، اسی چوکیدار کے سامنے گزرتے ہوئے اسی دفتر میں پہنچتا، اسی میز کے پیچھے ایک ہی کام کرتا رہا۔ وہ دنیا میں اکیلا تھا۔ دن کو دفتر میں اپنے ساتھیوں سے لاتعلق الگ تھلگ وہ اکیلا تھا اور رات کو اپنے مکان میں وہ اکیلا تھا۔ ہر مہینے وہ ایک سو فرانک اپنی ریٹائرمنٹ کے لئے پس انداز کرتا۔ ہر اتوار کو وہ شانزے لیزے کا ایک چکر لگاتا اور کسی کیفے میں بیٹھے ہوئے ارد گرد گزرتے ہوئے لوگوں، عورتوں اور گاڑیوں کو دیکھتا۔ دوسرے روز وہ بمشکل تمام ایک جملے میں اپنے ساتھیوں کو گزشتہ روز کی روئداد سناتا۔ ''کل بوآدی بولون میں بہت رونق تھی۔''

پھر ایک دن یونہی وہ گھومتا گھامتا پارک مونسو جا پہنچا۔ گرمیوں کے موسم میں چمکتی ہوئی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ گردونواح میں رہنے والی عورتیں بنچوں پر بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں اور اپنے اپنے بچوں کو کھیلتے دیکھ رہی تھیں۔

فراسواتیسئے کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آن پھنسا۔ ایک عورت اس کے سامنے سے دو بچوں کو انگلی سے لگائے گزری۔ قریباً دس برس کا بچہ اور چار سال کی بچی۔۔۔ یہ وہی تھی۔

وہ چند قدم چلتا گیا پھر لڑکھڑا کر ایک بنچ پر گر گیا۔ اس کے دل میں جیسے کوئی طوفان اٹھ کھڑا تھا۔ وہ اس کو پہچان نہ پائی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس کی سانسیں قابو میں آئیں تو وہ واپس اس کی جانب مڑا۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ بچہ خاموشی سے اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور بچی سامنے مٹی میں گھروندے بنا رہی تھی۔ یہ وہی تھی۔۔۔ بالکل وہی۔ لیکن قدرے سنجیدہ۔ سادہ لباس۔۔۔ چہرے پر متانت اور ٹھہراؤ۔

وہ نجانے کب تک اسے یونہی تکتا رہا۔ اس میں اس کے سامنے جانے کی ہمت نہ تھی۔ پھر اس بچے نے اس کی جانب چہرہ موڑا۔ فرانسواتیسئے کو یوں لگا کہ جیسے کسی نے اس کی آنکھوں کے درمیان ہتھوڑا دے مارا ہو۔ اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔۔۔ وہ اس کا بیٹا تھا۔ وہ اس کو دیکھتا گیا اور اسے یوں لگا کہ جیسے وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو۔ جیسے اسکے بچپن کی کوئی تصویر سامنے لا رکھی جائے۔ وہ اس وقت تک ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا رہا جب تک کہ وہ اٹھ کھڑی نہ ہوئی اور پھر وہ اس کے پیچھے چل دیا۔

اس رات وہ ایک پل بھی سو نہ پایا۔ اس بچے کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے جم گیا تھا۔ اس کا بیٹا!۔۔۔ کاش اسے علم ہوتا!۔۔۔ لیکن اگر علم ہوتا بھی تو کیا؟

وہ اس کے تعاقب میں اس کے گھر تک گیا۔ اور اسے معلوم ہوا کہ اس کے ایک ہمسائے نے ازراہِ ترحّم اس سے شادی کر لی تھی۔ درمیانی عمر کا اس کا شوہر ایک انتہائی شریف شخص کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس شخص نے نہ صرف اس کو قبول کر لیا تھا بلکہ اس کو معاف بھی کر دیا تھا اور ساتھ ساتھ اس بن باپ کے بچے کو بھی اپنی ولدیت میں لے لیا تھا۔۔۔ اس کے بیٹے کو!۔۔۔ فرانسواتیسئے کے بیٹے کو!

اب وہ ہر اتوار کو پارک مونسو پہنچ جاتا۔ ہر اتوار کو وہ اس کو دکھائی دیتی۔ اور ہر مرتبہ

اس پر ایک دیوانہ وار ناقابلِ برداشت وحشت سی طاری ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنی بانہوں میں اٹھالے۔۔۔اس کو چومے۔۔۔اس کو اپنے ساتھ لے جائے۔۔۔اس کو چرالے۔ غیر شادی شدہ تنہائی کی زندگی اس کو اندر ہی اندر سے دیمک کی مانند کھائے چلی جاتی تھی۔ذہنی عذاب کی ایک کانٹے دار بیل اس کے گرد لپٹی جاتی تھی جس کا بیج پدرانہ شفقت سے نکلا تھا اور جس کی آبیاری پشیمانی، تمنا اور حسد نے کی تھی اور جس کے ہر ہر کانٹے سے اپنی اولاد سے پیار کا وہ کرب پھوٹتا تھا جو قدرت نے ہر ذی روح کی قسمت میں لکھ چھوڑا ہے۔ایک روز اس سے رہا نہ گیا اور جیسے ہی وہ پارک میں داخل ہوئی وہ اس کی راہ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور زرد چہرے اور کپکپاتے ہوئے لبوں سے بولا، ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟'' اس نے آنکھیں اٹھائیں اس کو ایک نظر دیکھا اور اس کے ہونٹوں سے ایک دھیمی سی چیخ نکل گئی۔۔۔ خوف سے؟۔۔۔نفرت سے؟ پھر وہ اپنے دونوں بچوں کو اپنے پیچھے کھینچتی ہوئی پارک کے گیٹ کی جانب بھاگ گئی۔

وہ اپنے گھر جا کر ساری رات پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔

مہینے گزر گئے۔ لیکن وہ پارک میں دکھائی نہیں دی۔وہ دن رات بلکتا رہا۔ایک باپ کی محبت اس کو انگاروں پر لوٹائے دیتی تھی۔اپنے بیٹے کو سینے سے لگانے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔۔۔ کوئی بھی قربانی اور کوئی بھی جرم۔اس نے اسے خط بھی لکھے۔ کسی کا جواب نہ آیا۔بیسیوں خطوط لکھ ڈالنے کے بعد اسے یقین آ ہی گیا کہ وہ اپنا ارادہ نہیں بدلے گی۔پھر ایک روز اس نے اس کے شوہر کو خط لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔چاہے اس کے بدلے میں اسے سینے میں گولی ہی کیوں نہ کھانی پڑے۔

''موسیو! آپ کے لئے میرا نام ہی غیض و غضب کا باعث ہو گا۔ لیکن میں ندامت اور غم کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہو چکا ہوں کہ اب صرف آپ ہی میری آخری امید ہیں۔مجھے آپ سے ملاقات کے لئے صرف دس منٹ چاہئیں۔ آپ کے جواب کا طالب۔۔۔وغیرہ وغیرہ!''

دوسرے دن اسے ایک خط موصول ہوا۔ ''موسیو! میں کل بروز منگل بعد دوپہر تین بجے آپ کا منتظر رہوں گا۔''

۵

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے فرانسوا تیسیئے کا دل ایسے دھڑک رہا تھا کہ اسے ہر سیڑھی پر رکنا پڑا۔اسے اپنی چھاتی سے ایسی آواز سنائی دے رہی تھی کہ جیسے گھوڑوں کا ایک لشکر سرپٹ دوڑتا چلا جا رہا ہو۔اسے اپنے ہی دل کی دھڑکن سے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔پھر اس کی سانس رکنے لگی اور اسے خود کو سنبھالنے کے لئے دیوار کا سہارا لینا پڑا۔تیسری منزل پر پہنچ کر اس نے گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ایک آیا نے دروازہ کھولا۔

''موسیو فلامیل؟''

''جی ہاں۔یہ انہی کا گھر ہے۔اندر تشریف لائیے۔''

وہ ایک درمیانے درجے کے لیکن صاف ستھرے اور سلیقے سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔وہ کمرے میں اکیلا تھا اور کمرے کے عین درمیان میں یوں کھڑا تھا جیسے راستے سے بھٹک چکا ہو۔جیسے میدانِ کارزار میں اکیلا بچ رہنے والا سپاہی کھڑا ہو۔ایک دروازہ کھلا۔ایک شخص اندر داخل ہوا۔۔لمبا تڑنگا، سنجیدہ چہرہ،قدرے بھاری جسم،سیاہ کوٹ میں ملبوس۔۔۔اس نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا۔فرانسوا تیسیئے بیٹھ گیا اور ٹوٹتی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا، ''موسیو۔۔۔موسیو۔۔۔ معلوم نہیں کہ آپ مجھے جانتے ہیں یا نہیں۔۔۔ کہ آپ جانتے ہیں کہ۔۔۔۔''

موسیو فلامیل نے اس کی بات کاٹی، ''اس کی ضرورت نہیں۔مجھے میری بیوی آپ کے بارے میں سب کچھ بتا چکی ہے۔''

اس کا سپاٹ لہجہ کسی ایسے شخص کا غماز تھا جو سختی سے اپنا فیصلہ منوانے کا عادی ہو۔۔۔درمیانے طبقے کا ایک سادہ سا ایماندار شخص۔

فرانسوا تیسیئے نے ایک مرتبہ پھر ہمت کی، ''موسیو!میری یہاں آمد کا مقصد یہ ہے کہ میں دکھ،شرم اور پشیمانی سے مر رہا ہوں۔میں چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ،صرف ایک مرتبہ، اپنے بیٹے کو۔۔۔۔گلے لگا سکوں۔''

موسیو فلامیل نے کارنس کے ساتھ لٹکی ہوئی ڈوری ایک مرتبہ کھینچی۔دور کہیں گھر

میں گھنٹی بجنے کی دبی دبی سی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں بعد آیا نے دروازہ کھولا۔ ''لوئی کو بلاؤ!'' وہ الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ وہ دونوں انتظار میں ایک دوسرے کے سامنے خاموشی سے بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

پھر یکایک دروازہ کھلا اور دس سال کا ایک بچہ بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور سیدھا اس شخص کی جانب لپکا جسے وہ اپنا باپ سمجھتا تھا۔ لیکن کمرے میں ایک اجنبی کو دیکھتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ موسیو فلامیل نے سکون سے اس کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا اور بولا، ''بیٹے! اب ان سے بھی ملو۔''

بچہ دھیرے دھیرے نپے تلے قدموں چلتا ہوا اجنبی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

فرانسوٓا تیسیئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ سے ہیٹ چھوٹ کر قالین پر جا گرا۔ قریب تھا کہ وہ خود بھی حواس کھو بیٹھتا۔ موسیو فلامیل اٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ازراہِ وضع داری باہر سڑک کا جائزہ لینے لگا۔ بچہ حیرت سے کھڑا اس اجنبی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر قالین پر گرا ہوا ہیٹ اٹھایا اور اجنبی کی جانب بڑھا دیا۔ فرانسوٓا نے لپک کر بچے کو اپنے سینے سے لگا لیا اور دیوانوں کی مانند اس کو چومنے لگا۔ اس کے چہرے پر، پیشانی پر، بالوں پر، آنکھوں پر، رخساروں پر۔ بچہ اس ناگہانی افتاد کی تاب نہ لا سکا اور گھبرا کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے تڑپنے لگا، اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے منہ کو دوسری جانب دھکیلنے لگا۔ لیکن فرانسوٓا تیسیئے نے یکایک اس کو نیچے رکھ دیا۔

کمرے میں ایک سسکی کی آواز بلند ہوئی، ''خدا حافظ۔ خدا حافظ۔'' اور پھر فرانسوٓا تیسیئے وہاں سے یوں بھاگتے ہوئے باہر نکلا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

10

مُنّا

Le Petit

لموتنئے اپنے بیٹے کے ساتھ اکیلا رہ گیا تھا۔ جتنا عرصہ وہ اکٹھے رہے اس نے اپنی بیوی سے دیوانگی کی حد تک پیار کیا تھا۔۔۔ سچّا اور بے لوث پیار۔۔۔ بغیر کسی خامی اور خطا کے۔ وہ خود بھی ایک اچھا آدمی تھا، شریف اور سیدھا سادہ، نیک نیّت، اور کسی بھی بغض اور عداوت سے پاک۔ اس نے اس غریب لڑکی کو اپنے گھر کے قریب ہی دیکھا تھا اور اس کا رشتہ مانگ لیا تھا۔ وہ کپڑے کا کاروبار کرتا تھا اور اچھی خاصی آمدن ہوتی تھی۔ اس کو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی شک نہ ہوا کہ اُس لڑکی نے اِسے صرف اس کی شخصیت کی وجہ سے قبول نہ کیا تھا۔

اس کی بیوی نے بھی اسے خوش رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اسے اپنی بیوی کے علاوہ دنیا میں اور کوئی لڑکی دکھائی نہ دیتی تھی۔ کسی اور لڑکی کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ وہ اسے کسی نوجوان عاشق کی طرح لگاتار ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا۔ کھانے کے میز پر بھی وہ الٹی سیدھی حرکات کر بیٹھتا کیوں کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنی بیوی کے چہرے سے آنکھیں ہٹانا نہیں چاہتا تھا۔ کبھی وہ سالن کی پلیٹ میں شراب انڈیل دیتا اور کبھی نمکدانی میں پانی۔ پھر وہ بچوں کی طرح اپنی حماقت پر ہنستا اور کہتا، ''دیکھا میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں! مجھ سے یہ حرکات اسی پیار کی وجہ سے سرزد ہو جاتی ہیں۔''

اس پر وہ تسلیم و رضا اور سکون سے مسکراتی پھر اپنی آنکھیں پھیر لیتی جیسے اپنے شوہر کی گرمجوش نگاہوں کی تاب نہ لا سکتی ہو۔ پھر وہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی۔ کسی بھی موضوع پر۔ لیکن وہ میز کی دوسری جانب سے اس کے ہاتھ پکڑ لیتا اور سرگوشیاں کرتا، ''میری پیاری ژاںؔ! میری پیاری ژاںؔ!''

پھر وہ برداشت نہ کر پاتی اور کہہ اٹھتی، ''اچھا بس اب بہت ہو گیا۔ اب ہوش کرو۔ اپنا کھانا ختم کرو اور مجھے بھی کھانے دو!'' اس پر وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتا اور منہ میں ایک نوالہ ٹھونس لیتا اور اس کو ہولے ہولے چبانے لگتا۔

پانچ سال تک ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ پھر اچانک وہ امید سے ہو گئی۔ وہ تو خوشی کے مارے پاگل ہو گیا۔ نو ماہ تک وہ اپنی بیوی کے پہلو سے دور نہ ہوا۔ حتیٰ کہ اس کی ملازمہ، جو خود اس کے بچپن سے اس کے خاندان کے ساتھ تھی اور گھر میں اپنی مرضی چلانے کی عادی تھی، اس کو زبرستی گھر سے باہر دھکیل دیتی کہ وہ تھوڑی دیر باہر تازہ ہوا میں چہل قدمی کر آئے۔

اس کا صرف ایک اور قریبی دوست تھا، ایک نوجوان جو اس کی بیوی کا بچپن کا ساتھی تھا، اور مقامی پولیس تھانے میں نائب محرّر تعینات تھا۔ موسیو دوؔر طور ہفتے میں تین مرتبہ موسیو لموئنےؔ کے گھر کھانے پر آتا۔ کبھی وہ اس کی بیوی کے لئے پھول لاتا اور کبھی کبھار تھیٹر کے بکس کے ٹکٹ۔ اور عموماً کھانے کے بعد موسیو لموئنےؔ اپنی بیوی کی جانب مڑتا اور بلند آواز سے کہہ اٹھتا، ''تم جیسی بیوی اور اس جیسا دوست ہو۔۔۔ اس سے بڑھ کر اس دنیا میں اور کیا خوشی ہو گی۔''

اس کی بیوی بچے کو جنم دیتے ہوئے مر گئی۔ اس سانحے پر وہ خود بھی مرتے مرتے بچا۔ اپنے بچے کو دیکھ کر اس میں جینے کا حوصلہ پیدا ہوا۔۔۔ ایک کپکپاتی لرزتی ہوئی ننھی سی جان۔ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتا تھا، لیکن اس چاہت میں غم اور احساسِ زیاں بھی شامل تھا۔ اسکی چاہت میں اپنی بیوی کی موت کی یادیں بھی شامل تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے بیٹے میں اس کو اپنی بیوی کی محبت بھی دکھائی دیتی تھی۔ وہ اس کی بیوی کے وجود کا حصہ تھا۔۔۔ اس کی بیوی کے وجود کی ہی ایک کڑی تھی۔۔۔ اس کی محبت کی منزل تھا۔ اس بچے میں اس کی بیوی

ہی کی روح تھی جو صرف اس بچے کے بدن میں اتر گئی تھی۔ وہ اس دنیا سے اس لئے چلی گئی تھی کہ وہ بچہ اس دنیا میں آ سکے۔ اپنے بچے کے لئے باپ کا پیار جنون کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ لیکن اسی بچے نے اپنی ماں کی جان لے لی تھی۔ اسی بچے نے اسے اس کی محبت سے جدا کر دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو کھا کر ہی تو بڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی ماں کی زندگی کی اساس پی کر ہی تو بڑا ہوا تھا۔
موسیو لموتئے اپنے بیٹے کو واپس پنگھوڑے میں لٹا دیتا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے بغور دیکھتا رہتا۔ وہ گھنٹوں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ ہزاروں میٹھی میٹھی اور درد بھری یادوں میں کھو جاتا۔ اور پھر جب بچہ سو جاتا تو وہ اس کے چہرے پر جھک جاتا اور اس کے آنسو بچے کے لیس والے لباس میں گر کر جذب ہوتے رہتے۔

بچہ بڑا ہوتا گیا۔ باپ اپنے بچے کے بغیر ایک گھنٹہ بھی نہ گزار سکتا تھا۔ وہ اس کے ارد گرد منڈلاتا رہتا۔ وہ اس کو کندھے پر بٹھائے سیر کو لے جاتا۔ اس کے کپڑے بھی خود ہی بدلتا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتا دھلاتا۔ اسے خود کھانا کھلاتا۔ اس کا دوست موسیو دورطوٓر بھی اس بچے سے بہت مانوس تھا۔ وہ بھی باپ کی طرح اسے اپنی بانہوں میں لیتا اور اس کے باپ کی طرح اس سے کھیلتا رہتا۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر اچھالتا اور اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر لگاتار گھنٹوں گھڑ سواری کراتا۔ پھر یکایک وہ اس کے ننھے ننھے پیروں اور نازک گلابی ایڑیوں کو دیوانہ وار چومنے لگتا۔

موسیو لموتئے مسکرا اٹھتا، ''ہے نہ پیارا! ہے نا پیارا!'' موسیو دورطوٓر بچے کو گلے لگا لیتا اور اپنی مونچھوں سے اسے گدگدی کرتا۔

صرف سیلیسٹ، بوڑھی ملازمہ، بچے کی محبت میں کچھ گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کرتی تھی۔ اسے بچے کی شرارتوں پر بہت غصہ آتا اور ان دونوں دوستوں کا لاڈ و پیار بھی اس پر بہت کھلتا تھا۔ کبھی کبھار تو وہ چلّا اٹھتی، ''ایسے بھی کسی نے اپنے بچے کی تربیت کی ہو گی! آپ دونوں تو اس کو بندر بنا دیں گے۔'' سال گزرتے گئے اور ژاںٓ نو برس کا ہو گیا۔ بے جا لاڈ و پیار نے اس کو اتنا بگاڑ دیا تھا کہ وہ اے بی سی تک بھی نہ پڑھ سکتا تھا اور وہی کچھ کرتا جو اس کا جی چاہتا۔ وہ بہت ضدّی ہو چکا تھا، ہٹ دھرم ہو چکا تھا اور اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کر سکتا تھا۔ وہ جس کھلونے کی جانب اشارہ کرتا موسیو دورطوٓر فوراً اس کو خرید

کر لا دیتا۔ روزانہ اس کو ڈھیروں مٹھائیاں اور میٹھی گولیاں لا دیتا جس سے مُنّا پیٹ بھر لیتا۔ سیلیسؔط یہ سب دیکھ کر احتجاج کر اٹھتی، ''شرم آنی چاہئیے! آپ دونوں کو شرم آنی چاہئیے۔ آپ دونوں اس بچے کو تباہ کر رہے ہیں۔ تباہ کر رہے ہیں۔ سن رہے ہیں آپ دونوں۔ لیکن یہ سب ختم ہونا چاہئے۔ ہاں، ہاں، ایک دن یہ سب ختم ہو جائے گا۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔ اور جلد ہی۔ بہت جلد۔''

موسیو لموتئے مسکراتا اور کہتا، ''میں کیا کروں، اماں؟ میں اس سے اتنا پیار کرتا ہوں کہ میں اس کو انکار نہیں کر سکتا۔ تمہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔''

مُنّا کچھ دنوں سے کمزور ہو رہا تھا اور بیمار بھی دکھائی دیتا تھا۔ بقول ڈاکٹر کے وہ انیمیا کا شکار ہو رہا تھا۔ اس نے گوشت، فولاد بھری خوراک اور گاڑھی یخنی تجویز کی۔ جبکہ مُنّا مٹھائیوں اور میٹھی گولیوں کے علاوہ اور کوئی چیز کھانے سے قطعاً انکاری تھا۔ اس کا باپ بیچارہ محبت کے ہاتھوں مجبور اس کو کریم بھری پیسٹریوں اور چاکلیٹ بھرے کیک کھلاتا رہا۔

ایک شام سب کھانے کی میز پر بیٹھے تھے اور سیلیسؔط یخنی کا پیالہ اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ آج اس کے چہرے پر غیر معمولی سختی اور قطعیت نمایاں تھی۔ اس نے ہنڈیا سے ڈھکن اٹھایا اور ڈوئی اندر ڈالتے ہوئے ہنڈیا میز کے درمیان پٹخ دی۔ ''میں نے یہ یخنی خاص طور پر بنائی ہے۔ اور آج منّے کو ضرور کھانا ہو گا۔''

موسیو لموتؔئے نے مایوسی کے عالم میں اپنا سر جھکا لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب گڑبڑ ضرور ہو گی۔ سیلیسؔط نے اس کی تھالی میں یخنی انڈیلی اور تھالی اس کے سامنے کھسکا دی۔ اس نے فوراً ایک گھونٹ بھرا اور بچے کو سناتے ہوئے بولا، ''بات تو ٹھیک ہے۔ بہت ہی مزیدار ہے!''

ملازمہ نے منّے کی تھالی اپنے سامنے رکھی اور اس میں یخنی کی ایک ڈوئی بھر کر انڈیل دی۔ پھر تھالی منّے کے سامنے کھسکاتے ہوئے اس نے دو قدم پیچھے لئے اور خاموشی سے اس کو دیکھنے لگی۔

ژاںؔ نے آگے بڑھ کر تھالی کو سونگھا اور کراہت سے 'پھُو اہ' کرتے ہوئے تھالی پرے دھکیل دی۔ سیلیسؔط جس کا چہرہ غصّے سے پیلا پڑ گیا، لپک کر آگے بڑھی اور یخنی کا ایک چمچہ بھر کر زبردستی ژاںؔ کے ادھ کھلے منہ میں ٹھونس دیا۔ ژاںؔ کو اُچھو لگا، وہ زور سے کھانسا، منہ میں جو کچھ تھا اسے باہر تھوک ڈالا اور چلاّتے ہوئے اس نے ہاتھ کے ایک ہی وار سے میز پر پڑا ہوا

گلاس ادھر اچھال دیا جو سیدھا سیلیسؔط کے پیٹ پر جالگا۔ سیلیسؔط غصّے سے لال پیلی ہو گئی اور اس نے ایک ہاتھ سے منّے کا سر پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے یخنی کے چمچے بھر بھر کر اس کے منہ میں ٹھونسنے لگی۔ ژاںؔ ابکائیاں کرنے لگا، پیر پٹخنے لگا۔ خوب کسمسایا، تلملایا، ہوا میں بازو ادھر ادھر چلائے۔ چیختے چلّاتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا جیسے اس کی جان نکلنے والی ہو۔

اس کا باپ پہلے تو سکتے کے عالم میں ششدر یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک وہ کسی دیوانے کی طرح اٹھا اور لپک کر ملازمہ کو گردن سے دبوچ لیا اور پوری قوّت سے اس کو دیوار کی جانب دھکیل دیا۔ غیض و غضب سے اس کے منہ سے الفاظ نہ نکل پاتے تھے، "ب ب ---باہر---باہر---وحشی عورت!"

لیکن وہ پھر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور بکھرے ہوئے بالوں اور انگارے برساتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کو دھکا دیتے ہوئے چیخی، "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ مجھے اس لئے پیٹ رہے ہیں کہ میں اس بچے کو یخنی پلانا چاہتی ہوں جسے آپ مٹھائیاں کھلا کھلا کر مار ڈالیں گے؟"

وہ سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا اور اس کے منہ سے وہی الفاظ نکل رہے تھے، "باہر---دفع ہو جاؤ---دفع ہو جاؤ---وحشی عورت!"

لیکن نجانے کیوں آج وہ بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی، خم ٹھونک کر وہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی، "اچھا! تو اب آپ مجھ سے ایسا سلوک کریں گے؟ مجھ سے؟---مجھ سے؟ اور کس کے لئے؟ کس کے لئے؟ ---اس لڑکے کے لئے، جو آپکی اولاد ہی نہیں ہے! ہاں، ہاں! نہیں ہے--- نہیں ہے---یہ آپ کی اولاد نہیں ہے۔ میرے خدا!--- ساری دنیا جانتی ہے! صرف آپ ہی نہیں جانتے! چاہیں تو پوچھ لیں--- پنساری سے، قصائی سے، نانبائی سے پوچھ لیں۔ کسی سے بھی پوچھ لیں---" پھر وہ بڑبڑانے لگی، غصّے سے اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ وہ تھک ہار کر خاموش ہو گئی اور ہانپتے ہوئے اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگی۔

موسیو لموؔنئے پر مکمل سکتہ طاری ہو چکا تھا، اس کے بازو اس کے پہلو میں لٹک رہے تھے اور چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ زیرِ لب بولا، اس کی آواز دھیمی تھی لیکن اس کے

پیچھے آتش فشاں کے اندر ہی اندر پکنے والے لاوے کی مانند جذبات کی گرج صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا کہا؟۔۔۔ کیا کہا؟۔۔۔۔ تم نے کیا کہا؟''

سیلیسٹ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، اب اس کے چہرے پر غصّے کی جگہ خوف پھیلتا جا رہا تھا۔ موسیو لموننئے نے ایک قدم اس کی جانب بڑھایا، اور پھر بولا، ''کیا کہا؟۔۔۔ تم نے کیا کہا؟''

پھر وہ ایک پرسکون لہجے میں بولی، ''میں وہی کہہ رہی ہوں جو آپ سن رہے ہیں۔ میرے خدا! میں وہی کہہ رہی ہوں جو ساری دنیا جانتی ہے!''

اس نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور کسی جانور کی طرح اس کو دبوچنے کے لئے آگے بڑھا۔

لیکن وہ بوڑھی ہونے کے باوجود مضبوط تھی اور پھرتیلی بھی۔ وہ یکایک جھک کر اس کی گرفت سے بچ نکلی اور بھاگتی ہوئی میز کے دوسرے کونے پر جا کھڑی ہوئی، اور ایک مرتبہ پھر غصّے سے چلّانے لگی، ''دیکھیں! ذرا اسے دیکھیں تو! آپ بھی کتنے احمق ہیں، کیا اس کی شکل ہو بہو موسیو دورطوآ سے نہیں ملتی؟ اس کی ناک دیکھیں، اس کی آنکھیں دیکھیں! کیا آپ کی آنکھیں ایسی ہیں؟ اور یہ ناک؟ اور یہ بال؟ کیا آپ کی بیوی کے بال ایسے تھے؟ میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ ساری دنیا جانتی ہے! ساری دنیا! سوائے آپ کے۔ سارا شہر اس بات پر ہنستا ہے! اسے دیکھیں تو!۔۔۔۔''

پھر وہ دروازے کی جانب بڑھی، اس کو کھولا اور باہر نکل گئی۔

ژاں اس دوراں خوف کے مارے خاموشی سے یخنی کی تھالی کے سامنے بیٹھا رہا۔

قریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ واپس لوٹی۔ منّا مٹھائیوں، پھل بالائی کا ایک پیالہ اور شیرے میں ڈوبی ایک ناشپاتی سے پیٹ بھرنے کے بعد اب مربّے کے پیالے میں سے چمچے بھر بھر کے کھا رہا تھا۔

اس کا باپ گھر میں دکھائی نہ دیا تھا۔

سیلیسٹ نے بچے کو اٹھایا، اس کو چوما، اور پھر دبے پاؤں اس کو اس کے کمرے میں لے گئی، جہاں اس کو اس کے بستر میں لٹا دیا۔ پھر وہ کھانے والے کمرے میں واپس آئی، میز صاف

کی اور ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی۔اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ گھر میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مکمل خاموشی۔اس نے اپنے مالک کے کمرے کے دروازے سے کان لگایا۔اندر بالکل سکون تھا۔اس نے چابی کے سوراخ کے ساتھ آنکھ لگائی۔وہ میز پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھااور پر سکون دکھائی دے رہا تھا۔

وہ واپس کھانے والے کمرے میں اپنی کرسی پر آن بیٹھی۔جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ اسے یقین تھا کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔

وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھا ہوا تھا۔

اس نے صفائی شروع کی جیسے وہ حسبِ معمول ہر صبح کیا کرتی تھی۔اس نے جھاڑ پونچھ کی۔جھاڑو لگایا اور آٹھ بجے کے قریب موسیو لموتنئے کے لئے کافی کا پیالہ تیار کیا۔لیکن اس میں کافی کا پیالہ اس کے کمرے میں لیجانے کی ہمّت نہ ہوئی۔معلوم نہیں وہ کیا کہے؟ وہ انتظار کرتی رہی کہ وہ اسے گھنٹی دے کر بلائے گا۔ لیکن گھنٹی نہ بجی۔ نو بج گئے اور پھر دس بجے۔سیلیسٹ نے دھڑکتے دل کے ساتھ ناشتے کا ٹرے تیار کیا اور ڈرتے ڈرتے اپنے مالک کی خواب گاہ کے جانب قدم بڑھائے۔دروازے کے سامنے وہ رکی اور سن گن لینے کی کوشش کی۔اندر بالکل سناٹا تھا۔اس نے ہولے سے دستک دی۔جواب ندارد!

پھر جی کڑا کر کے اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور ناشتے کا ٹرے اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر جا رہا۔

موسیو لموتنئے کمرے کے عین وسط میں چھت میں نصب کڑے کے ساتھ بندھی رسی سے جھول رہا تھا۔اس کی زبان کھلے منہ سے باہر لٹکی ہوئی تھی۔دائیں پاؤں کا سلیپر فرش پر گرا پڑا تھا۔بائیاں سلیپر ابھی پاؤں میں ہی اٹکا ہوا تھا۔بستر کے قریب ہی ایک کرسی الٹی پڑی تھی۔

سیلیسٹ بدحواسی اور خوف کے عالم میں چیختی ہوئی باہر بھاگی۔سارے ہمسائے اکٹھے ہو گئے۔ڈاکٹر کے اندازے کے مطابق موت قریباً آدھی رات کو واقع ہوئی تھی۔

لکھائی کی میز پر ایک خط پڑا تھا جس پر موسیو دورطور کا نام تحریر تھا۔خط میں صرف ایک ہی سطر لکھی تھی۔

''میں جا رہا ہوں اور ممتا تمہارے حوالے کئے جا رہا ہوں۔''

11

خود کشی

Suicide

شائد ہی کوئی ایسا دن گزرتا ہے کہ کسی نہ کسی اخبار میں یہ خبر پڑھنے کو نہ ملے: ''بدھ کی رات فلاں سڑک کے رہائشی اچانک آدھی رات کے وقت گولی چلنے کی آواز سے جاگ اٹھے۔ گولی کی آواز مسٹر فلاں کے فلیٹ سے آئی تھی۔ فلیٹ کا دروازہ توڑ کر ہمسائے جب اندر داخل ہوئے تو انہوں نے مسٹر فلاں کو اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے پڑا دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں ابھی تک وہ ریوالور موجود تھا جس سے انہوں نے اپنی جان لی تھی۔ مسٹر فلاں کی عمر ستاون سال تھی۔ ان کے مالی حالات انتہائی مستحکم تھے اور زندگی کی تمام آسائشیں ان کی ملکیت میں تھیں۔ ان کے اس اقدام کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔''

وہ کون سا دکھ، کون سی انجانی اذیت، کون سی پوشیدہ مایوسی اور وہ کون سے ان دیکھے زخم ہوتے ہیں جو ان بظاہر خوش باش لوگوں کو خود کشی پر مجبور کر دیتے ہیں؟ ہم وجوہات تلاش کرتے ہیں۔۔۔ ناکام محبتوں کی داستانیں تصور میں لاتے ہیں۔۔۔ مالی مشکلات کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور چونکہ ہمیں کبھی بھی کوئی یقینی وجہ دستیاب نہیں ہوتی اس لئے ہم ان اموات پر ''پراسرار موت'' کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔

ایسی ہی ایک ''بلاوجہ خود کشی'' کرنے والے کی میز سے ہمیں ایک خط دستیاب ہوا جو

اس نے خود کشی کرنے سے پہلے لکھا تھا اور جو اس کے بھرے ہوئے ریوالور کے پاس پایا گیا تھا۔ یہ کافی دلچسپ تحریر تھی۔ اگرچہ یہ خط ایسے کسی اندوہناک سانحہ پر روشنی تو نہیں ڈالتا جسے ہم اس مایوسانہ عمل کی بنیادی وجہ کے طور پر پیش کر سکیں، پھر بھی اس خط میں ہمیں زندگی کی چھوٹی چھوٹی تکالیف کا ایک لامتناہی سلسلہ ملتا ہے، کسی ایسے اکیلے وجود کی شکست و ریخت دکھائی دیتی ہے جس کے خواب کرچی کرچی ہو چکے ہوں اور ایسے افسوسناک انجام کی توجیہہ ملتی ہے جس کو صرف انتہائی مضطرب اور حساس لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

خط کا مضمون پیش ہے:

''آدھی رات ہو چکی ہے۔ یہ خط مکمل کرنے کے بعد میں اپنی جان لے لوں گا۔ کیوں؟ میں اس کی وجوہات بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان کے لئے نہیں جو یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے بلکہ خود اپنے لئے۔ اپنی کمزور پڑتی ہوئی ہمت کو دوبارہ سہارا دینے کے لئے، اور خود کو اس قدم کی ناگزیریت کا یقین دلانے کے لئے جو زیادہ سے زیادہ ملتوی تو کیا جا سکتا ہے ترک نہیں۔

میری پرورش میرے سادہ دل والدین نے کی تھی جو بلا حجت ہر چیز پر ایمان لاتے تھے۔ ان کی طرح میں بھی ہر چیز پر یقین کرتا رہا۔ نجانے کب تک میں انہی خوابوں کی دنیا میں زندہ رہا۔ ان خوابوں کا آخری پردہ ابھی ابھی میری آنکھوں کے سامنے سے اٹھا ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے مجھے خود میں ایک عجیب سی تبدیلی آتی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ تمام واقعات اور اسباب جو کبھی میرے اندر جوش و ولولہ پیدا کر دیا کرتے تھے، میرا خون گرما دیا کرتے تھے، اب دھیرے دھیرے مٹتے جاتے ہیں۔ زندگی کا حقیقی معنی اپنی بے رحم اصلیت میں ابھی میری آنکھوں کے سامنے آیا ہے۔ پیار جیسے معصوم جذبے کے اصل محرکات نے میرے اندر اسکے لئے بھی نفرت پیدا کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نت نئے احمقانہ اور سحر انگیز خوابوں کے ہاتھوں میں ازلی کھلونے بنے رہتے ہیں۔

گزرتی عمر کے ساتھ ساتھ جدوجہد کی لاحاصلی سے۔۔۔ زندگی کے اس بھیانک راز سے۔۔۔ میں کسی حد تک مفاہمت کر چکا تھا۔۔۔ جب آج رات کھانے کے بعد اس کائنات کی بے وقعتی ایک نئی روشنی میں میرے سامنے آشکارہ ہوئی۔

کبھی میں بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ میں دنیا کی ہر چیز سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ راہ چلتی کوئی خوبصورت عورت۔۔۔ گلیوں کوچوں کی رونق۔۔۔ میرا گھر۔۔۔ میں تو اپنے لباس کی تراش خراش میں بھی بہت دلچسپی لیا کرتا تھا۔ لیکن ان سب مناظر کی تکرار نے میرا دل بیزاری سے بھر دیا اور میں یوں متنفر ہو گیا جیسے لگاتار روزانہ ایک ہی ڈرامہ دیکھنے سے اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ پچھلے تیس سال سے میں ایک ہی وقت پر بیدار ہوتا ہوں اور پچھلے تیس سال سے میں ایک ہی وقت پر ایک ہی ریستوراں میں وہی ایک ہی کھانا کھاتا ہوں جو مختلف ویٹر لا کر رکھتے ہیں۔

پھر میں نے سفر کرنے کے بارے میں سوچا۔ لیکن انجانی جگہوں پر مجھے ایسے اکیلے پن کا احساس ہوا کہ میں خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے خود کو اتنا اکیلا محسوس کیا۔۔۔ اس دنیا میں اتنا چھوٹا محسوس کیا کہ فوراً واپس اپنے شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ لیکن وہاں بھی وہی فرنیچر جو تیس سال سے اسی جگہ پر پڑا ہے۔۔۔ میری آرام کرسی کی فرسودگی جو میں نے کبھی بالکل نئی خریدی تھی۔۔۔ ہر رات میرے گھر کی وہی خوشبو۔۔۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ہر گھر سے بھی ایک مخصوص خوشبو آنے لگتی ہے۔ یہی چیزیں اور لاتعداد مزید چیزیں مجھے بیزار کر چکی ہیں اور اب تو میں اس بیزاری میں زندہ رہنے سے بھی بیزار ہو چکا ہوں۔

ہر چیز ویسے ہی پر ملال انداز میں ایک لامتناہی دائرے میں گھوم رہی ہے۔ جیسے میں اپنے دروازے میں چابی گھماتا ہوں۔۔۔ جس جگہ ہمیشہ ماچس کی ڈبیہ پڑی ہوتی ہے۔۔۔ کمرے کی بتی جلاتے ہی سب سے پہلے میری نظر جس چیز پر پڑتی ہے۔۔۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کھڑکی سے باہر چھلانگ مار دوں کہ شائد اسی طرح ان واقعات سے جان چھوٹ جائے جن سے ویسے نجات ناممکن ہے۔ ہر روز صبح شیو بناتے ہوئے میرے دل میں اپنا گلا کاٹ ڈالنے کی ایک شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور گالوں پر صابن لگا ہوا میرا چہرہ جسے میں روزانہ آئینے میں دیکھتا ہوں۔۔۔ ہمیشہ وہی۔۔۔ نجانے کتنی مرتبہ اسے دیکھ کر میں مایوسی سے رو دیا۔

اب مجھے ان لوگوں سے ملنے سے نفرت ہو گئی ہے جن کو میں کبھی بہت گرمجوشی اور اہتمام سے ملا کرتا تھا۔ میں ان کو اتنی اچھی طرح سے جان چکا ہوں کہ اب مجھے علم ہو گیا ہے کہ وہ کیا کہنے والے ہیں اور میں کیا جواب دوں گا۔ ان کی ایک ایک سوچ جس سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے میں اس سے واقف ہوں۔ ان کے استدلال کا کوئی پہلو میرے لئے نیا نہیں

ہے۔۔۔ ہر ذہن کسی سرکس کی مانند ہے جس میں وہی ایک بیچارہ گھوڑا ایک ہی گول چکر میں لگاتار دلکی چال چلتا رہتا ہے۔۔۔ ہم کچھ بھی کر لیں۔۔۔ کوئی بھی راستہ اختیار کر لیں۔۔۔انجام وہی ہوتا ہے۔۔۔ کسی پردے کے پیچھے کوئی غیر متوقع چیز نہیں ہوتی اور کوئی دروازہ کسی نئی راہ پر نہیں کھلتا۔ ہر ایک کو ایک گول چکر میں لگاتار گھومتے رہنا ہے۔۔۔ انہی خیالات کے گرد۔۔۔انہی خوشیوں کے گرد۔۔۔وہی لطف و مزاح۔۔۔ وہی عقائد۔۔۔وہی بے کیفی۔

آج شام ہی سے بہت گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ باہر سڑک دھند کے مرغولوں میں لپٹی ہوئی تھی جس کے کنارے نصب لمپ دھند میں موم بتیوں کی مانند دکھائی دے رہی تھیں۔ آج میں غیر معمولی طور پر بوجھل محسوس کر رہا تھا۔ شائد میرا ہاضمہ ٹھیک نہیں تھا۔ زندگی میں درست ہاضمہ ہی سب کچھ ہے۔ یہی ہے جو فنکاروں کو تخلیقی تحریک ۔۔۔جوانوں کو پیار کی خواہش۔۔۔ مفکروں کو نئے نظریات اور ہر شخص کو زندگی کی امنگ دیتا ہے۔ درست ہاضمہ ہی رغبت سے کھانے کا باعث بنتا ہے (جو کہ زندگی کی بہترین مسرّتوں میں سے ایک ہے) میں نے اکثر یہ بات محسوس کی ہے۔ بیمار پیٹ ہی شکوک و شبہات، بے اعتقادی، ڈراؤنے خواب اور موت کی آرزو کا باعث بنتا ہے۔۔۔ اگر آج شام میرا ہاضمہ درست ہوتا تو شائد میں اپنی جان نہ لیتا۔

جب میں اپنی آرام کرسی پر بیٹھا جس پر میں تیس سال سے روزانہ بیٹھتا ہوں، میں نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی تو یکا یک ایک ایسی ہولناک بیزاری نے مجھے آن لیا کہ مجھے یوں لگا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ پھر میں نے سوچا کہ خود سے فرار حاصل کرنے کے لئے کچھ کروں۔ بے عملی سے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی بہتر ہو گا۔ پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں اپنے کاغذات کو ہی ترتیب دے لوں۔

بہت عرصے سے میں سوچ رہا تھا کہ اپنے درازوں کی صفائی کروں۔ کیونکہ گزشتہ تیس سال سے میں اپنے تمام کاغذات، خطوط، بل وغیرہ ایک ہی میز پر پھینکتا چلا جاتا تھا۔ اور اسی بے ترتیبی ہی کی وجہ سے مجھے اکثر اوقات بہت زچ ہونا پڑا تھا۔ لیکن کسی بھی چیز کو ترتیب دینے کے خیال ہی سے مجھ پر ایک ایسی ذہنی اور جسمانی کاہلی چھا جاتی تھی کہ مجھ میں یہ کوفت والا کام

شروع کرنے کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی۔ بہر حال میں نے اس ارادے سے دراز کھولا کہ ضروری کاغذات سنبھال رکھوں گا اور باقی ضائع کردوں گا۔ پہلی ہی دراز میں اتنے سارے پرانے بوسیدہ کاغذات دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک کاغذ اٹھایا۔

آہ دوستو! اگر آپ کو اپنی زندگی سے تھوڑی سی بھی محبت ہے تو کبھی بھی پرانے کاغذات والی دراز کو نہ چھیڑیں۔۔۔۔ پرانے خطوط کے اس قبرستان میں قدم نہ رکھیں!

لیکن پھر بھی اگر اتفاقاً ایسا ہو جائے تو آنکھیں بند کر کے ان خطوط کی مٹھی بھر لیں تاکہ نادانستہ بھی آپ کی نظر کسی لفظ پر نہ پڑے، کوئی بھولی بسری تحریر دکھائی نہ دے جو آپ کو پرانی یادوں کے متلاطم سمندر میں پھینک دے۔ پھر یوں ہی ان کاغذات کو اٹھا کر آتشدان میں پھینک دیں اور جب ان کی راکھ بن جائے تو اسے مسل کر باریک سفوف بنادیں ورنہ آپ ماضی کی بھول بھلیّوں میں گم ہو جائیں گے جیسے میں پچھلے ایک گھنٹے سے گم ہو چکا ہوں۔

جو خطوط میں نے ابتدا میں پڑھے کیونکہ وہ سامنے ہی دھرے تھے وہ اتنے اہم نہیں تھے۔ یہ تازہ خطوط تھے اور ان کے لکھنے والے وہ لوگ تھے جو ابھی زندہ ہیں، جنہیں میں اب بھی اکثر و بیشتر ملتا رہتا ہوں اور ان کے ہونے نہ ہونے سے مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اچانک ایک لفافہ اٹھاتے ہوئے میں چونک گیا۔ اس پر بڑی اور نمایاں تحریر میں میرا نام لکھا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو چبھنے لگے۔ یہ خط میرے ایک عزیز ترین دوست کی جانب سے تھا۔ وہ جو میرے بچپن، میری جوانی کا ساتھی۔۔۔۔ میری امیدوں اور امنگوں کا ہمراز تھا۔۔۔ اس کی شبیہہ۔۔۔ اس کی گرمجوش مسکراہٹ۔۔۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ یوں میری آنکھوں کے سامنے آگئے۔۔۔ کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک ٹھنڈی لہر سی دوڑ گئی۔ ہاں، ہاں! مرنے والے بھی جی اٹھتے ہیں، کیونکہ میں نے خود اپنے دوست کو دیکھا ہے! اس دنیا سے تو ہماری یادوں کی دنیا کہیں زیادہ مکمل ہے۔ یہ ان کو بھی زندگی لوٹا دیتی ہے جو موت کی وادیوں میں اتر چکے ہوتے ہیں۔

لرزتے ہاتھوں اور ڈبڈبائی آنکھوں سے میں نے اس تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھا۔ میرے دل میں ایسا شدید درد اٹھا کہ میں کراہنے لگا جیسے کوئی میری ایک ایک ہڈی پسلی کسی آہنی شکنجے میں کچلے ڈالتا ہو۔

پھر آہستہ آہستہ میری ساری زندگی کسی کتاب کے پلٹتے اوراق کی مانند میری آنکھوں کے سامنے آتی گئی جیسے دریا میں سفر کرتے ہوئے کنارے پر نت نئے مناظر سامنے آتے ہیں۔ مجھے ایسے لوگ دکھائی دیئے جن کو بھولے ہوئے بھی اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ مجھے ان کے نام تک یاد نہیں رہے۔ بس یادوں کے پردے پر ان کے بے نام چہرے موجود تھے۔ اپنی ماں کے خطوط میں مجھے اپنے پرانے نوکر دکھائی دیئے۔۔۔ اپنا آبائی گھر دکھائی دیا جس کا ہر ایک کونہ کھدرا بچوں کی یادوں میں کندہ ہو جاتا ہے۔ پھر مجھے اپنی ماں کے مختلف لباس دکھائی دیئے جو وہ رائج الوقت فیشن کے مطابق پہنتی تھی، پھر اس کے بالوں کے انداز جو وہ اپناتی تھی۔ پھر وہ مجھے دیر تک ایک ریشمی لباس میں دکھائی دی جس پر لیس کا کام ہوا تھا۔۔۔ مجھے یاد آیا کہ یہی لباس پہنے ہوئے انہوں نے ایک روز مجھ سے کہا تھا، ''رابرٹ بیٹے! اگر تم نے سیدھا کھڑے ہونا شروع نہ کیا تو ساری عمر کے لئے تمہارے کندھے جھک جائیں گے۔''

ایک اور دراز کھولتے ہوئے میرے سامنے میری محبت اور پیار کی یادیں آن کھڑی ہوئیں۔ کسی لڑکی کا ڈانس کرنے والا سینڈل۔۔۔ ایک پھٹا ہوا رومال۔۔۔ اور ایک زنانہ زیر جامہ بھی۔۔۔ بالوں کی لٹ اور سوکھے ہوئے پھول۔ میرے پیار کی ان داستانوں نے مجھے حسرت و یاس کی گہری دلدل میں لا پھینکا۔۔۔ داستانیں جن میں مرکزی کردار ادا کرنے والی عورتیں اپنے سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہروں کے ساتھ ابھی تک بقید حیات تھیں ۔۔۔ شرمندہء تعبیر نہ ہونے والے خوابوں کی دلدل۔۔۔ آہ! وہ جواں اور روشن پیشانیاں جن پر یہ ریشمی سنہری زلفیں لہرایا کرتی تھیں۔۔۔ نرم و نازک ہاتھوں کا وہ لمس۔۔۔ وہ بولتی اور کچھ کہتی آنکھیں۔۔۔ وہ دھڑکتے دل۔۔۔ وہ مسکراہٹیں جو ہونٹوں کا وعدہ کرتی ہیں۔۔۔ وہ ہونٹ جو بانہوں میں بھر لینے کا وعدہ کرتے ہیں۔۔۔ اور وہ پہلا بوسہ! وہ کبھی نہ ختم ہو والا پہلا بوسہ۔۔۔ جب پلکیں بھاری ہو جاتی ہیں۔۔۔ اور جب آنے والے چند لمحوں کی بے پناہ خوشی میں ہر سوچ ہر سمجھ غرقاں ہو جاتی ہے۔

ان بھولی بسری پیار کے وعدوں کی نشانیوں کو مٹھیوں میں بھینچ بھینچ کر میں روتا گیا اور چومتا گیا۔ یادوں کے ان طوفانی تھپیڑوں میں میرا دل ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے اپنی ہر محبوبہ خلوت کے ان لمحات میں دکھائی دی جب پوری کائنات میں ایک دوسرے کے لئے صرف ہم دونوں ہی

تھے۔ مجھ پر ایسی ہولناک اذیت نازل ہوئی جو دوزخ کی کہانیوں میں بیان کی گئی اذیتوں سے بھی بڑھ کر تھی۔

پھر دراز کے کونے میں ایک ہی خط باقی رہ گیا۔ یہ خط میرا ہی لکھا ہوا تھا اور پچاس سال قبل میرے استاد نے اسکول میں لکھوایا تھا۔

''میری پیاری امّی جان!
آج میں سات سال کا ہو چکا ہوں۔ یہ شعور اور ادراک کی عمر ہے۔
میں آج اس دنیا میں مجھے لانے پر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔
فقط
آپ کا بیٹا جو آپ سے بہت پیار کرتا ہے۔ رابرٹ''

بس!۔۔۔اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔۔۔میں نے اپنی واپسی کا سفر مکمل کر لیا ہے۔ میں اپنی ابتدا تک پہنچ گیا ہوں۔ پھر اچانک میں نے سوچا کہ اب میری زندگی کے بقیہ دنوں میں کیا رہ گیا ہے۔۔۔ایک کریہہ اور اکیلا بڑھاپا۔۔۔ کمزوریاں اور بیماریاں۔۔۔اور پھر ایک دن مَیں اکیلا۔۔۔بالکل اکیلا۔۔۔اور سب کچھ ختم!۔۔۔ہمیشہ کیلئے ختم!

میز پر میرا ریوالور پڑا ہے۔۔۔میں اس میں گولیاں بھر رہا ہوں۔۔۔
۔۔۔پرانے خطوط کبھی نہیں پڑھنا چاہئیں۔''

بس یوں ہی بہت سے لوگ اپنی جان لے لیتے ہیں اور ہم بلا وجہ ان کی زندگی میں کوئی عظیم سانحہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔

12

اصلی نقلی

Les Faux bijoux

اس لڑکی سے موسیو لانتیں کی پہلی ملاقات اپنے ایک افسر کے گھر دعوت پر ہوئی تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اس کی محبت کا اسیر ہو گیا تھا۔ وہ ایک کلکٹر کی بیٹی تھی جس کا انتقال چند سال قبل ہوا تھا۔ اس کی ماں اس کو ساتھ لئے پیرس آن بسی تھی۔ اسے امید تھی کہ قریبی رہائشی گھرانوں سے میل جول کے باعث بیٹی کا رشتہ کسی اچھی جگہ ہو جائے گا۔ گو ان کے وسائل محدود تھے لیکن دونوں ماں بیٹی انتہائی سلیقہ شعار، نرم خو اور خاموش طبع تھیں۔

وہ لڑکی ان پاکدامن اور باوصف لڑکیوں میں سے تھی جس کے ساتھ ہر عقلمند نوجوان اپنی زندگی بتانے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس کے حسین چہرے پر فرشتوں کی سی شرم و حیا جھلکتی تھی، اور اس کے ہونٹوں پر ہر وقت کھیلنے والی ہلکی سی مسکراہٹ اس کی روح کی پاکیزگی کی عکاس تھی۔ جلد ہی ہر طرف اس کی پاکدامنی اور سلیقہ شعاری کی باتیں ہونے لگیں۔ لوگ کہتے نہ تھکتے، ''بڑا ہی خوش نصیب ہو گا جو اس کا دل جیتے گا۔ اس سے بہتر بیوی ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔''

موسیو لانتیں نے جو اس وقت ساڑھے تین ہزار فرانک کی معقول تنخواہ پر وزارت داخلہ میں ملازم تھا، لڑکی کی ماں سے اس کا رشتہ مانگا۔ اس کا رشتہ کسی لیت و لعل کے بغیر قبول کرلیا

گیا۔

وہ لڑکی موسیو لانتیں کی زندگی میں ناقابلِ بیان خوشیاں بھر لائی۔ اس نے گھر کا نظم و نسق ایسے سلیقے سے سنبھالا کہ وہ امرا کی مانند پر آسائش زندگی بسر کرتے دکھائی دیتے۔ وہ اپنے شوہر کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھتی۔ کسی بچے کی مانند اس کو بہلاتی مناتی اور اس کے بالوں کو سنوارتی۔ اس نے اپنے شوہر کو اتنا پیار دیا کہ شادی کے چھ سال بعد موسیو لانتیں کو احساس ہوا کہ وہ اپنی بیوی کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ شدّت سے چاہتا ہے۔ بس اس کی بیوی کے دو ہی شوق تھے جو موسیو لانتیں کو چنداں پسند نہ تھے۔ اس کی بیوی کو تھیٹر اور نقلی زیورات کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس کی سہیلیاں جو خود بھی سرکاری افسران کی بیویاں تھیں اسے ہر نئے کھیل کے پہلے شو کے ٹکٹ لا دیتیں اور اس کے شوہر کو چاہتے نہ چاہتے بھی مجبوراً اس کے ساتھ جانا پڑتا۔ سارا دن دفتر میں کام کرنے کے بعد اسے ایسی تفریحات سے بہت کوفت ہوتی۔

کچھ دنوں بعد موسیو لانتیں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ تھیٹر چلی جائے۔ شروع میں تو وہ اس بات پر آمادہ نہ ہوئی لیکن اپنے شوہر کے اصرار پر بالآخر رضامند ہو گئی۔ موسیو لانتیں کو اس بات سے قدرے اطمینان ہوا۔

تھیٹر کے ساتھ ساتھ وہ زیورات کی بھی دیوانی تھی۔ اس کا لباس تو شروع ہی سے ایک سا ہی ہوا کرتا۔ سادہ عمدہ تراش خراش والا لیکن ہمیشہ انتہائی شریفانہ۔ جبکہ اس کے کانوں میں مصنوعی ہیروں کے بڑے بڑے بندے جھولتے تھے جو بالکل اصلی ہیروں کی مانند جھلملاتے اور جگمگاتے۔ اس کی لمبی دودھیا گردن کے گرد نقلی موتیوں کی لڑیاں ہوتیں اور نازک کلائیوں میں نقلی سنہرے جڑاؤ کنگن۔ اس کی گھنی زلفوں میں شیشے کے نگینے جڑی کنگھیاں اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتیں۔

اس کا شوہر اکثر اوقات اس پر معترض ہوتا۔ وہ کہتا، ''میری جان، جب ہم اصلی ہیرے جواہرات خرید ہی نہیں سکتے تو تمہیں چاہئے کہ تم خود کو صرف اپنے حسن اور شرم و حیا سے آراستہ کیا کرو۔ یہی تو وہ ہیرے جواہرات ہیں جو فی زمانہ عورتوں میں نایاب ہیں۔''

لیکن وہ بس معصومیت سے مسکرا دیتی اور کہتی، ''میں کیا کروں؟ مجھے زیورات بہت اچھے

لگتے ہیں۔ بس یہی ایک تو مجھ میں خامی ہے۔ اب میں اپنی فطرت تو نہیں بدل سکتی۔''

پھر وہ موتیوں کا ایک نیکلیس اپنی مخروطی انگلیوں میں لپیٹتی اور جب شیشے کے جواہرات روشنی میں لشکارے مارتے تو کہتی، ''دیکھا؟ کتنے خوبصورت ہیں؟ بالکل اصلی دکھائی دیتے ہیں۔''

موسیولانتیں بھی مسکرا دیتا اور کہتا، ''تمہارے شوق بھی بڑے عجیب ہیں۔''

کبھی کبھار شام کو جب وہ اکیلے ہوتے تو آتشدان کے سامنے وہ اپنا چرمی بکس اٹھالاتی جس میں بقول موسیولانتیں کے ''الابلا'' رکھا ہوتا۔ پھر وہ انتہائی چاؤ اور لگن سے اپنے نقلی زیورات کو یوں انہاک کے عالم میں دیکھتی جیسے وہ کسی گہرے انجانے سرور کا باعث ہوں۔ پھر یکایک وہ موتیوں کی ایک لڑی اپنے شوہر کے گلے میں لپیٹ دیتی پھر کھلکھلا کر ہنستی اور کہہ اٹھتی، ''اوہ! تم کتنے عجیب دکھائی دیتے ہو!'' پھر وہ اپنی بانہیں اس کے گلے میں حمائل کر دیتی اور اس کے چہرے پر بوسے ثبت کرتی۔

جاڑے کی ایک رات وہ تھیٹر سے سردی کے مارے ٹھٹھرتی ہوئی ہوئی لوٹی۔ ساری رات کھانستی رہی اور آٹھ روز بعد پھیپھڑوں کی سوزش کے باعث اس جہان سے رخصت ہو گئی۔

موسیولانتیں پر غم واندوہ کی ایسی قیامت ٹوٹی کہ بیوی کی موت کے صرف ایک ماہ بعد ہی اس کے سر کے سارے بال سفید ہو گئے۔ وہ ساری ساری رات ہچکیاں لے کر روتا۔ اس کی مسکراہٹ۔۔۔ اُس کی آواز۔۔۔ اُس کی حرکات و سکنات۔۔۔ اس کی یادیں موسیولانتیں کے دل پر کچوکے لگاتیں۔ وقت کا مرہم بھی اس کے زخموں کو مندمل نہ کرسکا۔ دفتر میں جب اس کے سارے ساتھی گپ شپ میں مصروف ہوتے تو اس کی آنکھیں میں اچانک آنسو بھر آتے اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگتا۔ اس نے اپنی بیوی کے کمرے کی کسی چیز کو چھوا تک نہ تھا۔ ہر شے یوں ہی رہی جیسے اس کی زندگی میں تھی۔ اُس کا سارا سامان حتیٰ کہ اُس کے کپڑے بھی جوں کے توں دھرے رہے جیسے اُس کی موت کے دن پڑے تھے۔ اب وہ روزانہ اس کمرے میں اکیلا بیٹھا رہتا اور اُس کے بارے میں سوچتا رہتا جو اس کا سب کچھ تھی۔۔۔ جو اس کا سکون و قرار تھی۔۔۔ جو اس کا وجود تھی۔

لیکن زندگی مشکل تر ہوتی چلی گئی۔ اس کی وہی آمدن، جو اس کی بیوی کے

سلیقہ شعار ہاتھوں میں گھر کے تمام اخراجات کے لئے کافی تھی،اب اس کے اپنے ضروری اخراجات کے لئے بھی ناکافی ہوتی گئی۔وہ اکثر سوچتا کہ اس کی بیوی کیسے رقم پس انداز کر کے عمدہ شراب اور کھانے پینے کی نفیس اشیاء لایا کرتی، جب کہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ اب ایسی اشیاء خرید نہ سکتا تھا۔ پھر اس نے قرض اٹھانا شروع کر دیا اور جلد ہی اس کا بال بال قرض میں بندھ گیا۔ایک روز دفتر جاتے ہوئے تلاش کے باوجود سارے گھر میں اسے ایک فرانک بھی نہ ملا۔اس نے گھر کی کوئی چیز بیچنے کا فیصلہ کیا۔اس کے ذہن میں فوراً اپنی بیوی کے نقلی زیورات کا خیال آیا۔وہ شروع ہی سے ان مصنوعی جواہرات سے نالاں تھا اور ان کے استعمال کو فریب کہا کرتا تھا۔اب بھی ان کو دیکھ کر اس کی یادوں میں ایک کڑواہٹ سی آجاتی تھی۔اپنی موت سے کچھ دن پہلے تک بھی اس کی بیوی انہی نقلی زیورات کی خریداری میں مشغول تھی۔ قریباً ہر ہفتے وہ نئے زیورات لئے گھر لوٹتی۔وہ کافی دیر تک ان زیورات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اور پھر اس نے ایک قدرے وزنی گلوبند چنا جو اس کی بیوی کو بہت پسند تھا۔اس کے اندازے میں اس کی قیمت قریباً چھ سات فرانک ہو گی۔۔۔ گو اس کے نقش و نگار بڑی نفاست سے بنائے گئے تھے لیکن۔۔۔ پھر بھی تھا تو نقلی ہی۔

اس نے گلوبند اپنی جیب میں ڈالا اور کسی قابلِ اعتبار جوہری کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔بالآخر وہ ایک دکان میں داخل ہوا۔اندر ہی اندر وہ اپنی کسمپرسی اور اس سے بھی زیادہ ایک بے وقعت شئے کو بیچنے کے احساس سے خجالت کے بوجھ تلے جھکا جا رہا تھا۔

وہ جوہری سے بمشکل تمام یہی کہہ پایا،''میں اس کی قیمت کا اندازہ لگوانا چاہتا تھا۔''

جوہری نے گلوبند لیا، کچھ دیر اس کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے اپنے سنار کو بلایا اور دونوں گلو بند کے بارے میں آپس میں سر گوشیاں کرتے رہے۔پھر اس نے گلوبند کونٹر پر بچھا کر رکھ دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کا ناقدانہ جائزہ لینے لگا۔

موسیو لانتیں ان دونوں کی حرکات سے جھنجھلا اٹھا اور قریب تھا کہ وہ کہہ اٹھتا،''بس بہت ہو چکا۔مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ دو کوڑی کا بھی نہیں ہے۔'' کہ جوہری بول اٹھا،''جناب اس گلوبند کی قیمت بارہ سے پندرہ ہزار فرانک تک ہے۔لیکن میں اس وقت تک اسے خرید نہیں سکتا جب تک آپ اس کی ملکیت کا ثبوت نہ پیش کریں۔''

موسیو لانتیں کا منہ کھلا اور آنکھیں پھٹی رہی گئیں اور وہ جوہری کو دیکھتا رہا۔ وہ کچھ سمجھ نہ پایا کہ جوہری نے کیا کہا ہے۔ پھر وہ ہکلاتے ہوئے بولا، ''ک کیا کہا؟۔۔۔ کیا آپ کو یقین ہے؟'' جوہری نے سرد مہری سے جواب دیا، ''آپ چاہیں تو کہیں اور بھی کوشش کر کے دیکھ لیں۔ شائد ہی کوئی اور اس سے زیادہ پیشکش کر دے۔ میرے اندازے میں اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت پندرہ ہزار ہے۔ کوئی اس سے زیادہ قیمت نہ لگائے تو میرے پاس واپس آجایئے گا۔''

موسیو لانتیں نے، جواب تک حیرت کے سمندر میں غرقاں تھا، گلوبند اٹھایا اور اسے جیب میں ڈالے دکان سے باہر نکل آیا۔ اس نے جوہری سے کہا تھا کہ وہ سوچ کر جواب دے گا۔ باہر فٹ پاتھ پر اس کا قہقہے لگانے کو جی چاہا اور وہ خود سے کہنے لگا، ''احمق! کتنا احمق ہے! مجھے چاہیئے تھا کہ اس کی بات مان لیتا۔ اس جوہری کو اصلی اور نقلی کی کوئی پہچان نہیں ہے۔''

تھوڑی دور، رُو دلاپےؔ پر واقع وہ ایک اور جوہری کی دکان میں داخل ہوا۔ دوسرے جوہری نے گلوبند پر ایک نظر ڈالی تو بول اٹھا، ''اوہ! میں تو اس گلوبند کو خوب جانتا ہوں۔ یہ میری دکان ہی سے خریدا گیا تھا۔'' موسیو لانتیں کا دل دھک سے رہ گیا۔

''اس کی قیمت کیا ہو گی؟''

''میں نے تو بیس ہزار فرانک میں فروخت کیا تھا۔ میں اسے اٹھارہ ہزار فرانک میں خریدنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ کو قانون کے مطابق اس کی ملکیت کا ثبوت دینا ہو گا۔''

اس مرتبہ موسیو لانتیں ہکّا بکّا رہ گیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا، ''لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ ذرا احتیاط سے دیکھیئے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ۔۔۔ اس کی قیمت قدرے کم ہو گی۔''

جوہری نے پوچھا، ''آپ کا اسمِ گرامی؟''

''موسیو لانتیں۔ میں وزارت داخلہ میں ملازم ہوں۔ میں نمبر ۱۶، رُو دے مارتیرؔ میں رہتا ہوں۔''

جوہری نے اپنا کھاتہ کھولا اور چند ہی لمحوں میں فروخت کا اندراج ڈھونڈ نکالا۔

''جی ہاں۔ یہ گلوبند مادام لانتیں کے نام اس پتے پر بھیجا گیا تھا۔۔۔ ۱۶ رُو دے مارتیر۔

بیس جولائی ۱۸۷۶ء''

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔

موسیو لانتیں کی آنکھوں میں بے یقینی اور جوہری کی آنکھوں میں شک جھلک رہا تھا۔ پھر جوہری نے سکوت توڑا۔ ''آپ چاہیں تو گلوبند میرے پاس ایک دن کے لئے چھوڑ جائیں۔ میں آپ کو اس کی پکی رسید دوں گا۔''

موسیو لانتیں نے جلدی سے کہا، ''ہاں۔ کیوں نہیں۔'' پھر رسید جیب میں ڈالے وہ دکان سے نکل آیا۔

بہت دیر تک وہ بے مقصد سڑکوں پر پھرتا رہا۔ اس کے ذہن میں جھکّڑ چل رہے تھے۔ طرح طرح کے خیالات بگولوں کی مانند چکرا رہے تھے۔ وہ اس سارے معاملے کا کوئی جواز تلاش کر رہا تھا۔ اس کی بیوی کے پاس ایسے بیش قیمت جواہرات خریدنے کے لئے اتنے پیسے کبھی بھی نہ تھے۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔

لیکن پھر کیا یہ کوئی تحفہ تھا؟۔۔۔ تحفہ؟۔۔۔ تحفہ؟ لیکن کس کی جانب سے؟

اور۔۔۔ اور کیوں؟

چلتے چلتے اس کے قدم رک گئے اور وہ بھرے بازار میں فٹ پاتھ پر بت بن کر کھڑا ہو گیا۔ ایک خوفناک خیال اس کے دماغ میں کسی ناگ کی طرح پھن پھیلائے کھڑا ہو گیا۔ کہیں۔۔۔۔ اس کی بیوی؟

تو پھر باقی سب زیورات بھی تحائف ہی ہوں گے۔ اس کے قدموں تلے زمین لرزنے لگی۔ ارد گرد کے درخت ناچنے لگے۔ کھمبے سانپوں کی طرح ڈولنے لگے۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح بیہوش ہو کر زمین پر آ رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک ڈاکٹر کی دکان میں پایا جہاں راہگیر اس کو اٹھا لائے تھے۔ جب وہ گھر پہنچا تو اپنے کمرے میں بند رات گئے تک بلک بلک کر روتا رہا۔ نجانے کب تھک ہار کر وہ اپنے بستر پر جا گرا اور گہری نیند سو گیا۔

دوسرے دن سورج کی کرنوں نے اس کی آنکھیں کھولیں اور وہ ہولے ہولے دفتر جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ گزشتہ روز کے صدمے کے بعد دفتر میں سارا دن گزارنا بہت

مشکل تھا۔اس نے اپنے افسر بالا کو ایک خط لکھ بھیجا کہ وہ طبیعت کی ناسازی کی بنا پر دفتر نہیں آ سکتا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کو جوہری کے ہاں بھی جانا ہے۔اس کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ گلوبند جوہری کے پاس بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔وہ تیار ہو کر گھر سے باہر نکل آیا۔

صبح اپنے تمام رعنائیوں اور نیلگوں آسمان کے ساتھ شہر پر مسکرا رہی تھی۔ لوگ جیبوں میں ہاتھ ڈالے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔موسیو لانتیں ان لوگوں کو دیکھتا رہا اور سوچنے لگا۔ ''پیسے والے واقعی خوش ہوتے ہیں۔دولت گہرے سے گہرا گھاؤ بھی بھر دیتی ہے۔پیسہ ہو تو جب چاہیں جہاں چاہیں چل دیں اور کہیں بھی وہ لوازمات و تفریحات تلاش کر لیں جو غم و اندوہ کا یقینی علاج ہیں۔ کاش میں بھی دولت مند ہوتا!'' اس کے پیٹ میں بھوک سے مروڑ اٹھ رہے تھے لیکن اس کی جیب خالی تھی۔ پھر یکایک اس کے دماغ میں وہ گلوبند بجلی کے کوندے کی مانند لپکا۔اٹھارہ ہزار فرانک!اٹھارہ ہزار فرانک!اتنی بڑی رقم!

تیز تیز چلتا ہوا وہ جلد ہی رُو دلاپے میں واقع اسی جوہری کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔اٹھارہ ہزار فرانک!بیسیوں مرتبہ اس نے اندر جانے کا ارادہ کیا لیکن شرمندگی اس کے پیر جکڑے دیتی تھی۔ بھوک سے اس کے پیٹ میں اینٹھن شروع ہو چکی تھی اور اس کی جیبوں میں ایک فرانک تک نہ تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا اور بھاگتے ہوئے سڑک پار کی۔اس سے قبل کہ وہ اپنا ارادہ بدل دیتا وہ لپک کر دکان میں داخل ہو گیا۔

جوہری فوراً اس کی جانب بڑھا اور اسے کرسی پیش کی۔دکان کے دوسرے ملازموں نے اس کو کن انکھیوں سے دیکھا۔جوہری ہاتھ باندھ کر بولا، ''موسیو لانتیں، میں نے تصدیق کر لی ہے۔اور اگر آپ اب بھی گلوبند بیچنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں آپ کو بتائی گئی رقم پیش کروں؟''

موسیو لانتیں لڑکھڑائی ہوئی زبان سے بولا، ''جی ہاں!''

جوہری نے تجوری سے اٹھارہ بڑے نوٹ نکالے اور گن کر موسیو لانتیں کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔اس نے ایک رسید پر دستخط کئے اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے نوٹ اپنی جیب میں رکھ لئے۔دکان سے باہر جاتے ہوئے دروازے کے قریب جا کر وہ مڑا۔ جوہری کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جیسے وہ سب کچھ جانتا ہو۔

اس نے نظریں چراتے ہوئے جوہری سے کہا، ''میں۔۔۔ میرے پاس ایسے ہی کچھ اور زیورات بھی ہیں۔ کیا آپ وہ بھی خرید لیں گے؟''

جوہری ہتھیلیاں مسلتے ہوئے جھکا اور بولا، ''کیوں نہیں حضور!''

موسیولانتیں سنجیدگی سے بولا، ''ٹھیک ہے۔ میں ابھی آپ کو لا دیتا ہوں۔''

ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ سارے زیورات لئے واپس جوہری کے سامنے کھڑا تھا۔

ہیروں کے جھمکوں کی قیمت بیس ہزار فرانک تھی۔۔۔ہار پینتیس ہزار فرانک۔۔۔انگوٹھیاں سولہ ہزار۔۔۔ زمرّد اور یاقوت جڑا ایک اور نیکلس چودہ ہزار۔۔۔ ہیرے کی ایک زنجیر چالیس ہزار۔۔۔ مل ملا کر سارے زیورات کی قیمت ایک لاکھ چوالیس ہزار فرانک مقرر ہوئی۔

جوہری نے بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، ''یہ خاتون تو اپنی ساری بچت جواہرات میں لگانے کی عادی دکھائی دیتی ہیں۔''

موسیولانتیں نے گھمبیر آواز میں جواب دیا، ''یہ بھی سرمایہ کاری کا ایک طریقہ ہے۔''

اس روز اس نے ریستوران دووازیں میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے کے ساتھ اس نے وہ شراب پسند کی جس کی ایک بوتل کی قیمت بیس فرانک تھی۔ پھر اس نے ایک بگھی میں بیٹھ کر بوادبولوں کی سیر کی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ لوگوں کی وضع قطع پر تحقیرانہ نگاہ ڈالے بنا نہ رہ سکا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر لوگوں سے کہے، ''میں بھی دولت مند ہوں۔ میرے پاس دو لاکھ فرانک ہیں۔''

پھر اسے اپنی ملازمت کا خیال آیا۔ وہ اسی بگھی میں اپنے دفتر پہنچا اور بڑی خوشدلی سے اعلان کیا، ''میں اپنی ملازمت سے استعفیٰ دینے آیا ہوں۔ مجھے ابھی وراثت میں تین لاکھ فرانک ملے ہیں۔'' اس نے اپنے سابقہ ساتھیوں سے ہاتھ ملایا اور ان کو اپنے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں بتایا۔ پھر وہ رات کا کھانا کھانے کیفے آنگلے پہنچ گیا۔

وہ وضع قطع سے معزز اور دولت مند دکھائی دینے والے ایک شخص کے قریب جا بیٹھا اور کھانے کے دوران اس نے باتوں ہی باتوں میں اس کو بتایا کہ اس کو ابھی وراثت میں چار لاکھ فرانک ملے ہیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے تھیٹر سے بھی کوئی اکتاہٹ محسوس نہ

ہوئی۔ رات کا بقیہ حصّہ اس نے یونہی رنگ رلیاں مناتے ہوئے گزارا۔

چھ ماہ بعد اس نے دوسری شادی کرلی۔ اس کی دوسری بیوی بہت نیک اور پارسا عورت تھی۔ لیکن بلا کے غصّے کی مالک تھی۔ دوسری بیوی نے موسیو لانتیں کی بقیہ زندگی اجیرن بناڈالی۔

13

قتل

Un parricide

وکیلِ صفائی نے عدالت کے سامنے اپنے مؤکل کے دفاع میں دیوانگی کا عذر پیش کیا تھا۔ اس کے سوا اس عجیب و غریب جرم کی کیا توجیہہ پیش کی جاسکتی تھی؟ ایک صبح شاطوَع (Chatou) کے قریب دریا کے کنارے اونچی گھاس میں ایک مرد اور ایک عورت کی لاشیں پائی گئیں۔ دونوں ادھیڑ عمر اور شہر کے نامور دولت مندوں میں سے تھے۔ عورت تین سال قبل بیوہ ہوئی تھی اور ایک سال ہوا متوفی مرد سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ دونوں کی کسی سے دشمنی نہ تھی اور نہ ہی ان کو لوٹا گیا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ان دونوں کو کسی تیز دھار آلے سے پے در پے وار کرنے کے بعد یکے بعد دیگرے دریا میں پھینک دیا گیا ہو۔ ابتدائی تفتیش سے کچھ ظاہر نہیں ہوا۔ جن ملاحوں نے لاشوں کی اطلاع پہنچائی تھی ان سے پوچھ گچھ بھی لاحاصل رہی۔ حکام اس اندھے قتل کی تفتیش ختم کرنے ہی والے تھے کہ قریبی گاؤں کے ایک نوجوان بڑھئی جارج لوئی عرف 'نواب صاحب' نے خود ہی اس قتل کے ارتکاب کا اعتراف کرلیا۔

حکام کے ہر سوال کے جواب کے میں وہ یہی کہتا، ''میں اس شخص کو دو سال سے جانتا تھا اور اس عورت کو چھ ماہ سے۔ وہ اکثر اوقات میرے پاس پرانے فرنیچر کی مرمت کے لئے

آتے تھے، کیونکہ میں اس کام میں بہت ماہر ہوں''۔

اور جب اس سے یہ سوال پوچھا جاتا، ''تم نے ان کو کیوں قتل کیا؟''۔ تو وہ تواتر سے ایک ہی جواب دیتا، ''میں نے ان کو اس لئے قتل کیا کہ میں ان کو قتل کرنا چاہتا تھا''۔اس کے علاوہ اس سے اور کوئی بات نہیں اگلوائی جا سکی۔

دورانِ تفتیش یہ بات سامنے آئی کہ یہ نوجوان کسی کی ناجائز اولاد تھی جس کو پرورش کے لئے اس گاؤں میں کسی کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں اس کے ماں باپ اس کو فراموش کر بیٹھے تھے۔اس کا نام تو جارج لوئی ہی تھا لیکن چونکہ وہ شروع ہی سے ایک ذہین اور تمیز دار لڑکا ثابت ہوا تھا اور اپنے ہم عمر ساتھیوں کی نسبت کہیں زیادہ شائستہ اور نفیس عادات کا حامل تھا اس لئے سب لوگ اس کو 'نواب صاحب' کہہ کر پکارنے لگے اور جلد ہی اس کا یہی نام زبان زدِعام ہو گیا۔جب اس نے لکڑی کا کام شروع کیا تو کچھ ہی عرصے میں اس کی مہارت اور چابکدستی کا دور دور تک چرچا ہو گیا۔ کبھی کبھار وہ لکڑی کے مجسمے بھی بنایا کرتا تھا۔یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ پکا سوشلسٹ اور کمیونزم اور لاوجودیت کے نظریات کا پیروکار تھا۔ مہماتی ناولوں کا شوقین، اپنے علاقے میں خاصا اثر ورسوخ رکھنے والا اور مزدوروں اور کسانوں کے سیاسی جلسوں میں ایک شعلہ بیاں مقرر کے طور پر جانا جاتا تھا۔

وکیلِ صفائی نے اس کے دفاع میں دیوانگی کا عذر پیش کیا تھا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بڑھئی اپنے بہترین گاہکوں کو مار ڈالے جو دولت مند بھی تھے اور فراخ دل بھی؟ یہ بات ملزم نے خود تسلیم کی تھی۔ایسے گاہک جنہوں نے گزشتہ دو سال کے دوران اس سے تین ہزار فرانک کا کام کروایا تھا(اس کا ثبوت اس کے کھاتوں سے ملا تھا)۔ایک ہی جواز باقی رہ جاتا ہے۔۔۔دیوانگی!

ایک نچلے درجے کا فرد جو سارے بورژوا طبقے سے انتقام لینے کی خاطر دو امیروں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔اس موقع پر وکیلِ صفائی نے نہائت مہارت سے اسکی عرفیت 'نواب صاحب' کا ذکر بھی کر ڈالا جو علاقے کے لوگوں نے اس لاوارث کو دے رکھی تھی۔ساری عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے وکیلِ صفائی نے کہا، ''کیا یہ قسمت کی ستم ظریفی نہیں ہے؟ کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے جو ایسے بیچارے لاوارث نوجوان کو دیوانگی کی جانب دھکیل دے

جس کا نہ باپ ہے اور نہ ماں؟ یہ نوجوان جو جمہوریت کا حامی ہے۔۔۔ جمہوریت کا حامی؟ یہ تو ایسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے جس کے ارکان کو کچھ ہی عرصہ قبل حکومتِ وقت یا تو گولی سے اڑا دیتی تھی یا پھر جلاوطن کر دیتی تھی۔ اور اب یہی حکومت اسی سیاسی جماعت کا کھلی بانہوں سے استقبال کرتی ہے آتشزنی جس کے اصولوں میں اور سیاسی قتل جس کے روزمرّہ کے امور میں شامل ہیں۔ جن نظریات کی کبھی مذمّت کی جاتی تھی آج انہی کو سرعام خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ اسی بات نے اس نوجوان کو پاگل بنا دیا ہے۔ اس نوجوان نے جمہوریت پسندوں کو اور عورتوں کو۔۔۔ جی ہاں!۔۔۔ عورتوں کو موسیو گمبیتؔ اور موسیو گریویؔ(1) کی موت کے نعرے مارتے سنا۔ بس اس کا الجھا ہوا ذہن الٹ گیا۔ اس کے سر پر بھی خون سوار ہو گیا۔ بورژوا طبقے کا خون!

حضرات! اس قتل کا موردِ الزام ملزم نہیں بلکہ معاشرہ ہے۔

عدالت میں موجود حاضرین کی اکثریت اثبات میں سر ہلانے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ وکیل صفائی اپنی چابکدستی سے یہ مقدمہ قریباً جیت چکا ہے۔ وکیلِ استغاثہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر جج نے حسبِ معمول ملزم سے آخری سوال پوچھا، ''کیا ملزم کو اپنے دفاع میں کچھ کہنا ہے؟''

نوجوان اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کا قد درمیانہ، بال سنہری اور سرمئی آنکھیں پرسکون اور شفاف تھیں۔ اس دبلے پتلے نوجوان کی آواز بلند، گونج دار اور متوازن تھی اور اس کے پہلے چند الفاظ نے ہی اس کے بارے میں قائم کی گئی رائے کو بدل ڈالا۔ اس نے کسی مقرر کی طرح اونچی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ایک ایک لفظ اتنی صفائی سے ادا کیا گیا کہ اس کا ہر حرف کمرے کے آخری کونے تک سنائی دیا گیا۔

''جنابِ والا! چونکہ میں نہیں چاہتا کہ مجھے کسی پاگل خانے میں پھینک دیا جائے۔۔۔ اس سے تو سزائے موت ہی بہتر ہے۔۔۔ اس لئے میں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس عورت اور اس مرد کو اس لئے قتل کیا ہے کہ وہ دونوں میرے والدین تھے۔ میری کہانی سنیں اور فیصلہ صادر فرمائیں۔

ایک عورت نے ایک بچے کو جنم دیا اور پرورش کیلئے ایک آیا کے حوالے کر دیا۔ وہ یہ

تک نہیں جانتی تھی کہ وہ آیا اس معصوم جان کو کہاں لے گئی؟۔۔۔بچے کی قسمت میں ذلت اور ماتھے پر ناجائز پیدائش کی مہر ثبت کر دی۔۔۔ نہیں اس سے بھی بدتر۔۔۔اس کو موت کی سزا سنا ڈالی۔۔۔ کیونکہ اس نے تو اپنے تئیں اس بچے کو لاوارثوں کی طرح پھینک ہی ڈالا تھا۔ اور عین ممکن تھا کہ دوسری آیاؤں کی طرح ماہانہ خرچہ نہ ملنے کے باعث وہ آیا بھی اس بچے کو بھوک اور لاپرواہی کی موت مر جانے دیتی۔

لیکن مجھے جس عورت نے پالا وہ ایک نیک عورت تھی۔ وہ میری اپنی ماں سے زیادہ نیک، زیادہ عظیم، زیادہ عورت، اور زیادہ ماں تھی! اس نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا۔ اس نے یہ کام کر کے غلطی کی۔ اسے چاہئے تھا کہ وہ ایسے قابلِ نفرت وجود کو مر جانے دیتی جسے شہر کے معززین شہر کی مضافاتی بستیوں میں لا پھینکتے ہیں۔۔۔ جیسے غلاظت شہر سے باہر پھینک دی جاتی ہے۔ مجھے بچپن ہی سے ایک موہوم سا احساس تھا کہ میرے ماتھے پر کسی ذلت یا بدنامی کا داغ ضرور ہے۔ ایک دن دوسرے بچوں نے مجھے ''حرامی'' کہہ کر پکارا۔ انہیں اس گالی کا مطلب ہی معلوم نہیں تھا، جو ان میں سے کسی نے اپنے گھر میں سنی ہو گی۔ مطلب تو مجھے بھی معلوم نہیں تھا لیکن پھر بھی یہ گالی میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اتر گئی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں سکول میں سب سے ذہین لڑکا تھا۔ اگر میرے ماں باپ مجھے لاوارث پھینک دینے کے جرم کا ارتکاب نہ کرتے تو شائد میں بھی ایک شریف اور معزز شخص ضرور بن چکا ہوتا۔ یہ جرم میرے خلاف کیا گیا تھا۔ میں اس جرم کا شکار تھا اور وہ اس جرم کے مرتکب تھے۔ میں بے یار و مددگار تھا اور وہ ظالم اور بے رحم۔ انہیں مجھ سے محبت کرنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے مجھے دھتکار دیا۔

انہوں نے مجھے زندگی دی۔۔۔ لیکن کیا زندگی کوئی تحفہ ہے؟ کم از کم میرے لئے تو یہ ایک تہمت ہے۔ مجھے دھتکارنے کے بعد تو میرے پاس ان کا دیا ہوا صرف انتقام ہی رہ گیا ہے۔ جو ظلم انہوں نے مجھ پر ڈھایا ہے اس سے بڑھ کر غیر انسانی، اندوہناک اور اذیت ناک ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کی تحقیر کی جائے وہ جوابی بیان دیتا ہے۔ جس کا مال لوٹ لیا جائے وہ بزورِ بازو اپنا مال واپس لے لیتا ہے۔ جس کو دھوکہ دیا جائے، بے وقوف بنایا جائے یا تشدد کا نشانہ بنایا جائے وہ لڑتا مرتا ہے۔ جس کو زخم لگایا جائے وہ قتل کرتا ہے۔ جس کو ذلیل

کیا جائے وہ قتل کرتا ہے۔ مجھے لوٹا گیا، دھوکہ دیا گیا، تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اخلاقی طور پر ذلیل کیا گیا، اور بے عزّت کیا گیا اور یہ سب ان مجرمان سے بھی کہیں زیادہ جن کے جرائم کو آپ معاف کر دیتے ہیں۔

میں نے صرف انتقام لیا ہے۔ میں نے قتل کیا ہے۔ یہ میرا حق تھا۔ انہوں نے ذلّت اور خواری کی جو زندگی گزارنے پر مجھے مجبور کیا تھا اس کے بدلے میں میں نے ان کی خوش و خرم زندگی چھین لی۔ آپ اس کو پدر کشی یا مادر کشی کہیں گے۔ کیا یہ لوگ واقعی میرے والدین تھے؟ جن کے لئے میں ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تھا۔۔۔ ایک خوف۔۔۔ بدنامی کا ایک داغ؟ جن کے لئے میری پیدائش ایک سانحہ تھا اور میری زندگی ذلّت کا ایک اندیشہ؟ لذّت کے چند لمحات کی خواہش میں انہیں ایک بن چاہی اولاد مل گئی۔ انہوں نے اپنی اولاد کا خاتمہ کر ڈالا۔ مجھے موقع ملا تو میں نے بھی ان سے وہی سلوک کیا۔

حالانکہ ابھی کچھ عرصہ قبل ہی میرے دل میں ان کے لئے پیار پیدا ہونے چلا تھا۔

جیسا کہ میں نے کہا میرا باپ پہلی مرتبہ دو سال قبل میرے پاس آیا تھا۔ مجھے کوئی شک نہ ہوا۔ اس نے مجھے کچھ چیزیں بنانے کو کہا۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ اس نے رازاری کی قسم اٹھاتے ہوئے علاقے کے پادری سے میرے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ پھر وہ اکثر و بیشتر آنے لگا۔ وہ مجھے کام کا آڈر دیتا اور فراخ دلی سے منہ مانگی ادائیگی کیا کرتا۔ کبھی کبھار وہ ادھر ادھر کی باتیں بھی کیا کرتا۔ اس دوران میں مجھے اس سے کچھ انس سا پیدا ہونے لگا۔ اس سال کے شروع میں وہ اپنی بیوی۔۔۔ میری ماں۔۔۔ کو بھی اپنے ساتھ لایا۔ جب وہ میری دکان میں داخل ہوئی تو کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند کپکپا رہی تھی۔ پھر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ایک گلاس پانی مانگا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔۔۔ بس ادھر ادھر میرے کام کو دیکھتی رہی اور لاتعلقی سے 'ہوں، ہاں' میں اپنے شوہر کے سوالات کے جوابات دیتی رہی۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے سوچا کہ شائد نفسیاتی مریضہ تھی۔

ایک ماہ بعد وہ پھر واپس آئی۔ لیکن اس مرتبہ وہ قدرے پر سکون اور خود پر قابو پائے ہوئے تھی۔ اس روز وہ کافی دیر ٹھہری ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس دن اس نے مجھے ایک بڑا آڈر دیا۔ اس کے بعد وہ تین مرتبہ آئی لیکن میں مزید کچھ نہ جان پایا۔ لیکن ایک روز اچانک وہ

مجھ سے میری زندگی کے بارے میں پوچھنے لگی۔۔۔ میرا بچپن۔۔۔ میرے والدین۔

میں نے جواب دیا، ''خاتون، میرے والدین وہ بدنصیب تھے جنہوں نے مجھے لاوارث پھینک ڈالا تھا۔'' یہ سن کر اس نے ایک ہاتھ اپنے دل پر رکھا اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ میرے دل میں ایک کوندا سا لپکا، ''یہی میری ماں ہے۔'' لیکن میں نے اس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ میں ابھی اس کو مزید دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ جاننا چاہتا تھا۔

دوسری جانب میں نے بھی ان کے بارے میں کچھ معلومات اکٹھی کر رکھی تھیں۔ مجھے علم تھا کہ ان دونوں کی شادی پچھلے جولائی میں ہوئی تھی اور کہ میری ماں تین سال قبل بیوہ ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں کے مطابق ان دونوں کا عشق میری ماں کے پہلے شوہر کی زندگی میں ہی شروع ہو چکا تھا لیکن اس بات کا کبھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ واحد ثبوت میں تھا۔۔۔ وہ ثبوت جسے پہلے پہل چھپانے کی کوشش کی گئی اور بعد میں ضائع کرنے کی۔ بحرحال میں ان کی جانب سے کسی اشارے کا منتظر رہا۔

ایک شام وہ پھر حسبِ معمول میرے باپ کے ہمراہ آئی۔ اس شام اس پر ایک غیر معمولی اضطراب طاری تھا۔ ساری شام اس کی نگاہیں میرا چہرہ ٹٹولتی رہیں جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ پھر جانے سے پہلے وہ رکی اور مجھ سے کہنے لگی، ''دیکھو، تم ایک شریف ایماندار اور محنتی نوجوان ہو اس لئے میں تمہارا بھلا چاہتی ہوں۔ یقیناً کبھی نہ کبھی تم شادی کرنے کا ارادہ کرو گے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں کہ تم آزادی اور بے فکری سے اپنی پسند کی لڑکی کو اپنا سکو۔ میری اپنی پہلی شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی تھی اس لئے مجھے معلوم ہے کہ یہ کتنا بڑا عذاب ہوتا ہے۔ لیکن اب میں آزاد ہوں، دولت مند، بے اولاد، اپنی مرضی کی مالک۔۔۔ یہ لو، اس سے اپنی شادی کا بندوبست کر لینا۔''

اس نے میرے ہاتھ میں ایک موٹا لفافہ تھما دیا۔

میں چند لمحے اس کو تکتا رہا پھر میں بولا، ''آپ میری ماں ہیں؟''

وہ یوں لڑکھڑائی جیسے کسی نے اس کو دھکا دیا ہو اور اپنا سر جھکا لیا کہ میں اس کو دیکھ نہ پاؤں۔ اس کے شوہر نے۔۔۔ میرے باپ نے۔۔۔ اس کو کندھوں سے تھام لیا اور چیخ کر بولا، ''تم پاگل تو نہیں ہو گئے کیا؟''

میں نے جواب دیا، ''بالکل نہیں۔ میں جان چکا ہوں کہ آپ ہی میرے ماں باپ ہیں۔ میں ایسے دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ آج اعتراف کرلیں تو میں اس بات کو ہمیشہ اپنے سینے میں راز رکھوں گا۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں آج جو بھی ہوں وہی رہوں گا۔۔۔ ایک بڑھئی!''

میرا باپ یوں ہی میری ماں کو کندھوں سے تھامے سہارا دیئے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ میری ماں اب سسکیاں لے کر رونے لگی تھی۔ میں نے لپک کر دروازے کی کنڈی میں تالا ڈال دیا اور چابی اپنی جیب میں ڈال لی۔ پھر میں نے اپنی ماں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''ان پر ایک نظر ڈالیں اور پھر کہیں کہ یہ میری ماں نہیں ہے!''

یہ سنتے ہی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ شائد وہ اس خیال سے خوفزدہ ہو گیا تھا کہ جس راز کو انہوں نے آج تک چھپائے رکھا تھا وہ اچانک کھل کر زمانے بھر کے سامنے آجائے گا۔ اور یوں ایک ہی لمحے میں ان کا نام ونمود، عزت و وقار خاک میں مل جائے گا۔ پھر وہ کہنے لگا، ''تم ۔۔۔ تم ۔۔۔ بدمعاش ہو! ۔۔۔ تم ہم سے دولت ہتھیانا چاہتے ہو۔۔۔ اور مدد کرو ان نیچ لوگوں کی! اور مدد کرو! اور احسان کرو ان پر!''

اس دوران میری ماں بدحواسی میں ایک ہی جملہ دہرائے جاتی تھی، ''چلو یہاں سے! چلو یہاں سے!'' میرے باپ نے جب دروازہ مقفل پایا تو مڑ کر بولا، ''اگر تم نے اسی وقت یہ دروازہ نہ کھولا تو میں تمہیں دھوکہ دہی اور حبسِ بے جا کے الزام میں قید کروادوں گا۔'' میں نے خاموشی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور ان کو ڈھلتی ہوئی شام کے سائے میں بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا۔

یکا یک مجھے احساس ہوا کہ میں آج ایک بار پھر یتیم ہو گیا ہوں۔۔۔ ایک بار پھر مجھے لاوارث بنادیا گیا ہے اور ایک بار پھر مجھے اکیلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایک ناقابلِ برداشت دکھ، وحشت، بدنامی کے خوف اور کراہت کے احساس نے چاروں طرف سے مجھے کچلنا شروع کر دیا۔ مجھے اپنے سارے بدن میں سے اس ظلم کے خلاف بغاوت کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں۔۔۔ اس ظلم، کمینگی، ذلت اور اپنی محبت کو دھتکارے جانے کے خلاف!

میں ان کے تعاقب میں بھاگ اٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شاطوع کے ریلوے اسٹیشن کو جانے

کے لئے وہ سین کے کنارے والا راستہ لیں گے۔ جلد ہی میں نے ان کو جالیا۔ اب اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔ میں خاموشی سے ان کے پیچھے جا پہنچا تا کہ وہ میری قدموں کی آہٹ نہ سن پائیں۔ میری ماں ابھی تک ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ مجھے اپنے باپ کی آواز آئی، ''یہ سب تمہاری غلطی ہے۔ تم اس سے کیوں ملنا چاہتی تھی؟ موجودہ حالات میں تو یہ انتہائی احمقانہ بات تھی۔ ہم دور رہتے ہوئے خاموشی سے بھی تو اس کی مدد کر سکتے تھے۔۔۔ سامنے آئے بنا۔۔۔ جب ہم اس کو کبھی اپنا بیٹا کہہ ہی نہیں سکتے تو اس سے یوں ملنے کا کیا فائدہ؟۔۔۔''

میں لپک کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ان سے گڑ گڑا کر کہا، ''دیکھا! میں جانتا تھا آپ ہی میرے ماں باپ ہیں۔ آپ ایک مرتبہ تو مجھے چھوڑ چکے ہیں اب کیا دوسری مرتبہ پھر مجھے دھتکار دیں گے؟''

پھر۔۔۔ جنابِ عالی۔۔۔ پھر میرے باپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ میں قسم اٹھاتا ہوں، اپنی عزت کی، قانون اور عدالت کے سامنے میں قسم اٹھاتا ہوں کہ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ جب میں نے اس ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پھر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ میری جیب میں پرکار ہوتی تھی۔ میں نے وہی نکال کر اس پر پے در پے وار کر دیئے۔ میری ماں نے چیخنا شروع کر دیا، ''بچاؤ! قاتل!'' اور مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔۔۔ تب شائد میں نے اس کو بھی مار ڈالا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں نے اس وقت کیا کیا تھا؟ بعد میں جب میں نے ان دونوں کو وہاں پڑے دیکھا۔۔۔ تو سوچے سمجھے بغیر ان دونوں کو دریا میں پھینک دیا۔۔۔ بس۔۔۔ اب اپنا فیصلہ سنایئے!''

ملزم بیٹھ گیا۔ اس انکشاف کے بعد عدالت اگلی ساعت تک برخاست کر دی گئی۔ جو عنقریب ہونے والی ہے۔

اگر آپ جیوری کے رکن ہوتے تو اس مادر کشی اور پدر کشی کے جرم کا کیا فیصلہ کرتے؟

نوٹ: موسیو گریوی (M. Grévy) ۱۸۷۹ء میں فرانس کے صدر تھے۔ موسیو گمبیٹا (M. Gambetta) دائیں بازو کے ایک سیاستدان تھے جو اس کہانی کی اشاعت کے چند روز بعد ہی وفات پا گئے۔

14

سیموں کا باپ
Le papa de Simon

دوپہر ہو چکی تھی۔ سکول کی گھنٹی بجی اور لڑکے ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے باہر کو بھاگے۔ لیکن باہر نکلتے ہی منتشر ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کی بجائے وہ چند قدم دور پھر سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر رک گئے اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

بات دراصل یہ تھی کہ آج صبح بلانشوٹ کا بیٹا سیموں پہلی مرتبہ سکول آیا تھا۔

سب لڑکوں نے اپنے گھروں میں بلانشوٹ کا ذکر سن رکھا تھا۔ اگرچہ ان سب کی مائیں اس سے میل ملاپ رکھتی تھیں لیکن اس کی غیر موجودگی میں اس کا ذکر قدرے تحقیر آمیز ہمدردی سے کیا جاتا تھا۔ وجہ نہ جانتے ہوئے بچے بھی ماؤں کی دیکھا دیکھی اس سے ایسا ہی برتاؤ رکھتے تھے۔

سیموں ان کے لئے انجان تھا۔ وہ کبھی گھر سے باہر دکھائی نہ دیتا تھا۔ نہ کبھی وہ ان کے ساتھ گاؤں کی گلیوں میں بھاگا اور نہ ہی دریا کے کنارے کھیلا۔ وہ اس سے قطعاً مانوس نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک چودہ پندرہ سال کے لڑکے سے، جو یوں لگتا تھا کہ سب جانتا تھا، قدرے تجسس اور حیرت کے ساتھ ایک راز سنا اور ایک دوسرے کو بتایا۔ لڑکے نے آنکھ مارتے ہوئے رازداری سے کہا، ”تمہیں معلوم ہے۔۔۔ سیموں ۔۔۔ اس کا کوئی باپ

نہیں ہے!''

عین اسی لمحے لابلانشوٹ کا بیٹا سیموں سکول کے دروازے پر نمودار ہوا۔

وہ سات آٹھ سال کا دبلا پتلا، قدرے زرد، لیکن صاف ستھرا شرمیلا سا لڑکا تھا۔

وہ خاموشی سے اپنی ماں کے گھر کی جانب چل دیا۔ لیکن اس کے ہم جماعت لڑکے، جن کی آنکھوں میں ان لڑکوں کی سی شرارت تھی جو کسی کا مذاق اڑانے کے درپے ہوں، سرگوشیاں کرتے ہوئے اس کا پیچھا کرنے لگے اور بالآخر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

''اوئے تم؟ تمہارا کیا نام ہے؟''

اس نے جواب دیا ''سیموں''

دوسرے لڑکے نے پلٹ کر پوچھا، ''سیموں کیا؟''

وہ گھبرا کر پھر بولا، ''سیموں''

لڑکا چلا کر بولا، ''سیموں کے ساتھ کیا ہے؟۔۔۔ یہ تو کوئی نام نہ ہوا۔۔۔ سیموں!''

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، وہ تیسری مرتبہ بولا، ''میرا نام سیموں ہے۔''

اس پر شیطان لڑکوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اسے چھیڑنے والے لڑکے نے فاتحانہ انداز میں کہا، ''دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ اس کا کوئی باپ نہیں ہے۔''

اب چاروں جانب خاموشی چھا گئی۔ سب لڑکے اس غیر معمولی، ناممکن اور عجیب وغریب بات پر حیرت زدہ تھے۔۔۔ ایسا لڑکا جس کا کوئی باپ نہ ہو! وہ سب اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عفریت ہو۔ اب انہیں اپنی ماؤں کی اس ناقابلِ فہم نفرت سمجھ میں آنے لگی جس کا اظہار وہ سیموں کی ماں لابلانشوٹ کے لئے کرتی تھیں۔ سیموں اس دوران ایک درخت کے تنے سے پشت ٹکا کر کھڑا ہو گیا اور وہاں یوں ساکت کھڑا رہا جیسے کسی آفت نے اس کو مفلوج کر ڈالا ہو۔ اس نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ وہ اس خوفناک الزام کا کوئی جواب نہ دے سکا کہ اس کا کوئی باپ نہیں ہے۔ پھر سوچے سمجھے بغیر یکا یک وہ چیخ اٹھا، ''ہاں۔ میرا باپ ہے۔''

اس لڑکے نے پھر پوچھا، ''تو پھر کہاں ہے وہ؟''

سیموں سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ خاموش رہا۔ ارد گرد کھڑے ہوئے لڑکے بلند آواز

سے قہقہے لگانے لگے۔ ان دیہاتی لڑکوں میں وہی ہیجان پیدا ہو چکا تھا جو باڑے میں بند مرغوں کو اپنے ہی کسی کمزور اور زخمی ساتھی کو ٹھونگیں مار مار کر ختم کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یکا یک سیموں کی نظر اپنے ساتھ کھڑے ایک لڑکے پر پڑی جو اس کے پڑوس میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ سیموں کی مانند وہ لڑکا بھی ہمیشہ صرف اپنی ماں کے ساتھ ہی دکھائی دیتا تھا۔

سیموں نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تمہارا بھی تو نہیں ہے! تمہارا باپ بھی تو نہیں ہے!''

لڑکے نے جواب دیا، ''ہاں ہے! میرا باپ تو ہے۔''

''تو پھر کہاں ہے؟'' سیموں نے پلٹ کر سوال کیا۔

لڑکا قدرے فخریہ انداز میں بولا، ''وہ مر چکا ہے۔ میرا باپ تو قبرستان میں ہے۔''

لڑکوں کے ہجوم میں داد و تحسین کی بھنبھناہٹ اٹھی۔

سیموں نے دونوں ہاتھوں سے اس لڑکے کے بال نوچ لئے، اس کے گھٹنوں پر ٹھڈے برسانے لگا اور اس کے گال کاٹ کھانے کو لپکا۔ اب ان دونوں میں زبردست دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔ لیکن جلد ہی سیموں بری طرح پٹنے کے بعد فاتحانہ نعرے لگاتے ہوئے لڑکوں کے حصار میں زمین لوٹ رہا تھا۔ پھر وہ خاموشی سے مشینی انداز میں اٹھا اور جیسے ہی مٹی میں اٹا ہوا اپنا کوٹ جھاڑنے لگا تو لڑکوں میں سے کوئی بولا،

''اب جاؤ اور اپنے باپ کو بتاؤ۔''

اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ وہ اس سے زیادہ طاقتور تھے، اسے پیٹ چکے تھے لیکن وہ انہیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ حقیقت تھی کہ اس کا کوئی باپ نہیں تھا۔ چند لمحوں تک تو وہ ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتا رہا جو اس کا دم گھونٹ رہے تھے۔ پھر جب اس کا سانس رکنے لگا تو وہ خاموشی سے سسکیاں لیتے ہوئے رونے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھتے ہوئے لڑکے فرطِ مسرت سے وحشی ہو گئے اور وحشیوں ہی کی مانند ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ اس کے گرد گھیرا ڈال کر ناچنے لگے اور ایک آواز میں ایک ہی فقرہ دہرانے لگے،

''باپ نہیں ہے۔باپ نہیں ہے۔''

پھر یکلخت سیموں کی سسکیاں بند ہو گئیں۔ غم و غصے نے دفعتاً اس پر ایک جنونی کیفیت طاری کر ڈالی۔اس کے قدموں تلے کنکریاں پڑی تھیں اس نے سوچے سمجھے بغیر کنکریاں اٹھا کر اپنی گرد شور مچاتے ناچتے ہوئے لڑکوں پر پوری طاقت سے کھینچ ماریں۔ان میں سے چند کے کنکریاں لگیں اور وہ چیختے چلاّتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔باقی لڑکے اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ ٹھٹھہ مخول اڑانے والے بزدلوں کے ایک گروہ کی مانند جس کی مڈبھیڑ جان پر کھیل جانے والے کسی مشتعل شخص سے ہو جائے، باقی ماندہ لڑکے بھی وہاں سے فرار ہو گئے۔ بن باپ کا سیموں اکیلا دریا کی جانب بھاگ اٹھا۔اسے ایک واقعہ یاد آ چکا تھا اور اب اس نے دریا میں ڈوب جانے کا ارادہ باندھ لیا تھا۔

قریباً آٹھ روز قبل گاؤں میں مانگ تانگ کر گزر بسر کرنے والا ایک بھکاری اپنے حالات سے تنگ آ کر دریا میں کود گیا تھا۔ سیموں نے اس کی لاش دریا سے باہر نکالے جانے کا منظر دیکھا تھا۔ بیچارہ بھکاری جو عموماً پژمردہ اور بدصورت دکھائی دیتا تھا اب موت کی آغوش میں اپنے بھیگے لمبے بالوں اور زردی مائل چہرے کے ساتھ کتنا پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔اس کی کھلی آنکھوں میں بھی سکون ہی سکون تھا۔ قریب کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا تھا،''یہ تو مر گیا۔''

ایک دوسرے آدمی نے جواب دیا،''ہاں۔اب یہ خوش ہے۔''

سیموں نے بھی دریا میں کود جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس کا کوئی باپ نہ تھا اس بیچارے بھکاری کی مانند جس کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ تھا۔

وہ دریا کے کنارے پہنچ گیا اور پانی کا بہاؤ دیکھنے لگا۔ صاف و شفاف پانی میں مچھلیاں دفعتاً نمودار ہوتیں اور سطح پر منڈلاتی ہوئی مکھیوں کو پکڑ کر پھر پانی میں غائب ہو جاتیں۔ وہ مچھلیوں کے تماشے میں اتنا محو ہو گیا کہ رونا دھونا بھول گیا۔ لیکن جیسے کسی طوفان کے دوران دھیمی ہوا کے جھونکوں کے درمیان تیز ہوا کے تھپیڑے درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکتے ہیں اسی طرح اس کے دل میں رہ رہ کر یہی خیال ابھرتا،

''میں دریا میں ڈوبنے چلا ہوں کیونکہ میرا کوئی باپ نہیں ہے۔''

آسمان میں سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ دھوپ سے گھاس تک میں تمازت پیدا ہو چکی تھی۔ پانی آئینے کی مانند دھوپ کی کرنیں منعکس کر رہا تھا۔ لڑائی جھگڑے اور رونے دھونے کی تکان کے بعد اس پر سکون ماحول میں قدرے خوشی کا احساس ہوا اور اس کا جی چاہا کہ وہ یہیں دھوپ کی تمازت میں گھاس پر لیٹ جائے۔

اچانک اس کے پیروں کے درمیان سے ایک چھوٹا سا مینڈک کودا۔ وہ اسے پکڑنے کو دوڑا۔ لیکن مینڈک بچ نکلا۔ سیموؔں اس کے تعاقب میں بھاگا۔ تین مرتبہ مینڈک اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ بالآخر وہ اسے پچھلی ٹانگ سے پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ مینڈک اپنی جان چھڑانے کے لئے تگ و دو کرنے لگا اور اس کی جدوجہد پر سیموؔں خوب ہنسا۔ مینڈک نے یکا یک اپنی پچھلی ٹانگیں سرکنڈوں کی مانند اکڑا لیں اور اگلی ٹانگیں ہوا میں یوں لہرانے لگا جیسے انسانی ہاتھ ہوں۔ اس کی گول پیلی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔ مینڈک کو اس کیفیت میں دیکھ کر سیموؔں کو اپنا ایک کھلونا سپاہی یاد آ گیا جو ایسے ہی باریک سرکنڈوں پر نصب تھا اور سرکنڈوں کو ہلانے سے یوں حرکت کرتا تھا جیسے پریڈ کر رہا ہو۔ پھر اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔۔۔ پھر اپنی ماں کا۔۔۔ اور وہ ایک مرتبہ پھر رنج و الم سے مغلوب ہو کر رونے لگا۔ اس کا سارا وجود کپکپانے لگا۔ وہ گھاس پر دوزانو بیٹھ گیا اور رات کو سونے سے پہلے کی دعا دہرانے لگا۔ لیکن وہ اپنی دعا مکمل نہ کر سکا کیونکہ شدّتِ غم سے ایک مرتبہ پھر وہ ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ اب اسے اور کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا اور کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ بس بے اختیار سسکیاں بھرتا رہا۔

اچانک کسی نے ایک بھاری ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا اور فضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔

"لڑکے! کیا ہوا؟ کیوں زار و قطار رو رہے ہو؟"

سیموؔں نے پلٹ کر دیکھا۔ لوہاروں کے لباس میں ملبوس گھنگریالے سیاہ بالوں اور ڈاڑھی والا ایک دراز قد شخص کھڑا مسکراتی نگاہوں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ سیموؔں نے گلو گیر آواز اور آنسوؤں بھری نگاہوں سے جواب دیا،

"انہوں میں مجھے پیٹا ہے۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ میرا۔۔۔ کوئی۔۔۔ میرا کوئی باپ

نہیں ہے۔''

وہ شخص مسکراتے ہوئے بولا، ''کیا؟ باپ تو ہر ایک کا ہوتا ہی ہے۔''

بچے نے ہچکیوں کے درمیان جواب دیا،

''لیکن۔۔۔میرا۔۔۔میرا۔۔۔میرا کوئی باپ نہیں ہے۔''

یہ جواب سن کر اس شخص کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ وہ لابلانشوٹ کے لڑکے کو پہچان چکا تھا۔ اور اگرچہ وہ خود اس علاقے میں قدرے نوارد تھا لیکن پھر بھی اسے لابلانشوٹ کے ماضی کا عمومی سا اندازہ ضرور تھا۔

لوہار بولا، ''بیٹے رومت! تسلّی رکھو! آؤ میں تمہیں تمہارے گھر لے چلتا ہوں۔ وہاں پتہ چلاتے ہیں کہ تمہارا باپ کہاں ہے۔''

یوں وہ دونوں چلنے لگے۔ چلتے چلتے لوہار نے سیموں کا ہاتھ تھام لیا۔ لابلانشوٹ سے ملاقات کے خیال پر زیرِلب مسکرا دیا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ گاؤں کی خوبصورت ترین عورتوں میں سے ایک ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ جو عورت ایک مرتبہ گمراہی کی راہ پر چل چکی ہو وہ دوبارہ بھی اسی راہ کو اختیار کر سکتی ہے۔

وہ ایک چھوٹے لیکن انتہائی صاف ستھرے سفید مکان کے سامنے آن رکے۔

''یہ رہا میرا گھر!'' لڑکا چلاّ اٹھا، ''امّاں؟''

دروازے میں ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس پر نظر پڑتے ہی لوہار کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اسے فوراً احساس ہو گیا تھا کہ اس دراز قد زرد رُو عورت کے سامنے کوئی ہنسی مذاق نہیں ہو گا۔ وہ دروازے کی دہلیز پر یوں مدافعانہ انداز میں کھڑی تھی جیسے وہ اپنے اس گھر کو ایک مرد سے بچانا چاہتی ہو جہاں کسی دوسرے مرد نے اس سے بیوفائی کی تھی۔ لوہار اس کا یہ درشت انداز دیکھ کر قدرے گڑبڑا گیا اور اپنی ٹوپی ہاتھ میں تھامے ہوئے ہکلاتے ہوئے بولا،

''دیکھئے خاتون! آپ کا بیٹا دریا کے قریب کھو گیا میں اسے واپس لایا ہوں۔''

لیکن سیموں نے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں حمائل کرتے اور ایک مرتبہ پھر منہ بسورتے ہوئے کہا، ''نہیں، امّاں! میں تو وہاں ڈوبنے گیا تھا۔ کیونکہ دوسرے لڑکوں نے مجھے آج مارا

ہے۔۔۔انہوں نے مجھے مارا ہے کیونکہ میرا کوئی باپ نہیں ہے۔''

نوجوان عورت کے رخساروں پر یکایک سرخی پھیل گئی۔ اس نے فوراً سیموںؔ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے گالوں پر آنسو بہنے لگے۔ لوہار کو، جو اس صورتحال میں گھبرا گیا تھا، سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ لیکن سیموںؔ اچانک اپنی ماں کو چھوڑ کر اس کی جانب لپکا،

''کیا تم میرے باپ بنو گے؟''

ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ لابلانشوٹؔ شرم کے مارے اپنے ہاتھ سینے پر باندھے سر جھکائے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ سٹپٹائے ہوئے لوہار کی جانب سے کوئی جواب نہ ملنے پر بچہ پھر بولا،

''اگر تم میرے باپ نہیں بنو گے تو میں واپس جا کر ڈوب مروں گا۔''

لوہار موقع پاتے ہی سے ہنستے ہوئے بولا، ''ہاں بھئی۔ کیوں نہیں۔ ضرور بنوں گا۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' لڑکا بولتا گیا، ''تاکہ جب دوسرے لڑکے تمہارا نام پوچھیں تو میں انہیں بتا سکوں۔''

لوہار نے جواب دیا، ''فیلیپؔ!''

سیموںؔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا جیسے اس نام کو اچھی طرح ذہن نشین کر رہا ہو۔ پھر اپنے بازو پھیلاتے ہوئے، طمانیت سے بولا، ''تو پھر ٹھیک ہے فیلیپؔ۔ تم میرے باپ ہو۔''

لوہار نے بچے کو ہوا میں اٹھایا اس کے دونوں رخساروں پر بوسے ثبت کئے اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔ اگلی صبح جب سیموںؔ سکول پہنچا تو دوسرے لڑکوں کے استہزائیہ قہقہوں نے اس کا استقبال کیا اور چھٹی کے وقت جب سب لڑکے گزشتہ روز کی طرح اس کو ستانے اکٹھے ہوئے تو سیموںؔ نے یوں یہ الفاظ ادا کئے جیسے پتھر کھینچ مار رہا ہو، ''میرے باپ کا نام فیلیپؔ ہے۔''

اس پر چاروں جانب ہنسی کا طوفان بپا ہو گیا۔

''فیلیپؔ کون؟۔۔۔ یہ فیلیپؔ کیا ہے؟۔۔۔ یہ خالی خولی فیلیپؔ کیا ہوتا ہے؟۔۔۔ یہ فیلیپؔ تم کہاں سے اٹھا لائے؟''

سیموںؔ منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن اسے اپنی بات پر اتنا کامل یقین تھا کہ ان لڑکوں کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ڈٹا رہا۔ آج وہ بھاگنے کی بجائے اپنی جان پر کھیل جانے پر تیار تھا۔ لیکن اسی وقت سکول ماسٹر نمودار ہوا اور لڑکے ادھر ادھر بکھر گئے اور وہ اپنے گھر اپنی ماں کے پاس لوٹ آیا۔

اگلے تین ماہ میں لمبا لوہارا کثر لابلانشوٓط کے گھر کے آس پاس آتا جاتا رہا۔ کبھی کبھار وہ لابلانشوٓط کو کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے سلائی بنائی کرتے دیکھتا تو ہمت کر کے اس سے چند لمحے بات چیت بھی کرتا۔ وہ بھی انتہائی شائستگی سے اس کو جواب دیتی لیکن دھیمے لہجے میں۔ اس نے لوہار سے کبھی ہنسی مذاق نہ کیا اور نہ ہی کبھی اسے اپنے مکان میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ لیکن اس کے باوجود، دوسرے تمام مردوں کی مانند لوہار بھی قدرے شیخی خورہ تھا، اور اس کا خیال تھا کہ اس سے باتیں کرتے ہوئے لابلانشوٓط کے چہرے پر شرم و حیا کی سرخی چھا جاتی ہے۔

لیکن کرچی کرچی ہوئی عزّت دوبارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور اگر حاصل ہو بھی جائے تو اتنی شکستہ ہوتی ہے کہ لابلانشوٓط کی شرم و ندامت کے باوجود اڑوس پڑوس میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔

جہاں تک سیموٓں کا تعلق ہے وہ تو اپنے نئے باپ سے دیوانگی کی حد تک پیار کرنے لگا تھا۔ قریباً ہر شام جب لوہار اپنا کام ختم کر تا تو وہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتا۔ اب وہ باقاعدگی سے سکول جاتا اور دوسرے لڑکوں سے سر اٹھا کر ملتا جلتا اور ان کی الٹی سیدھی باتوں کا کوئی جواب نہ دیتا۔

ایک دن وہی لڑکا جس سے پہلے دن اس کی لڑائی ہوئی تھی، اس سے کہنے لگا،

''تم نے جھوٹ کہا ہے۔ تمہارا کوئی فیلیپؔ نام کا باپ نہیں ہے۔''

سیموٓں نے قدرے پریشانی کے عالم میں پوچھا، ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

لڑکے نے ہتھیلیاں مسلتے ہوئے کہا، ''کیونکہ اگر تمہارا کوئی باپ ہوتا تو وہ تمہاری ماں کا شوہر ہوتا۔''

سیموٓں لڑکے کی اس دلیل کی حقیقت سے گڑبڑا گیا لیکن پھر بھی فوراً بولا، ''وہ میری ماں کا شوہر ہو نہ ہو لیکن وہ میرا باپ تو ہے۔''

لڑکا طنزیہ انداز میں دانت نکوستے ہوئے مسکرایا اور بولا، ''یہ تو ہو سکتا ہے لیکن وہ تمہارا باپ نہیں ہو سکتا۔''

لابلانشوؔط کا بیٹا خاموشی سے سر نیہوڑائے خیالوں میں گم بوڑھے لوٗازوںؔ کے لوہار خانے کی جانب چل دیا جہاں فیلیپؔ لوہار کام کرتا تھا۔ لوہار خانہ درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان واقع تھا۔ وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور صرف دہکتی ہوئی بھٹی کے لپکتے ہوئے شعلوں کی روشنی ہی میں وہاں کام میں مصروف لوہار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ نہانیوں پر ہتھوڑے برسا رہے تھے جن کے شور سے کان کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ وہ عفریتوں کی مانند شعلوں میں گھرے کھڑے تھے، ان کی نگاہیں سرخ لوہے پر مرکوز تھیں جن پر وہ ضربیں لگا رہے تھے۔ ان کی لاچار امیدیں فضا میں ہتھوڑا بلند ہوتے ہی بیدار ہوتیں اور ہتھوڑے کی ضرب کے ساتھ ہی دم توڑ جاتیں۔

سیموںؔ دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور فیلیپؔ کے قریب جا کر اس کی آستین کھینچی۔ لوہار مڑا۔ دوسرے لوہاروں نے بھی اپنا کام روک دیا اور سیموںؔ کی جانب متوجہ ہو گئے۔ لوہار خانے میں یکا یک خاموشی چھا گئی۔ پھر خاموش لوہار خانے میں سیموںؔ کی باریک آواز بلند ہوئی، ''فیلیپ! میشوؔد کے بیٹے نے ابھی مجھے کہا ہے کہ تم میرے باپ نہیں ہو۔''

''کیوں نہیں ہوں؟'' لوہار نے پوچھا۔

''اس لئے کہ تم میری ماں کے شوہر نہیں ہو۔''

کسی کو ہنسی نہ آئی۔ نہانی پر دھرے ہتھوڑے کے دستے کو تھامے اور اپنے مضبوط ہاتھ کی پشت سے ماتھا ٹیکے فیلیپؔ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ باقی چاروں لوہار کام روکے اس کے ردِ عمل کا انتظار کر رہے تھے۔ ان دیو قامت لوہاروں کے بیچ میں کھڑا ننھا سیموںؔ چہرہ اٹھائے فیلیپؔ کے جواب کا بے چینی سے منتظر تھا۔ پھر ایک لوہار نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے فیلیپؔ سے کہا، ''دیکھو فیلیپؔ! اپنی بد قسمتی کے باوجود لابلانشوؔط ایک نیک ایماندار اور بہادر لڑکی ہے اور کسی بھی شریف آدمی کی بیوی بننے کے لائق ہے۔''

تینوں لوہار اس کی تائید کرتے ہوئے بولے، ''یہ تو سچ ہے۔''

پہلا لوہار بولتا رہا، ''اگر کسی لڑکی سے گناہ سرزد ہو جائے تو اس میں اس کا کیا قصور

ہے؟اسے تو شادی کا جھانسہ دیا گیا تھا۔ میں خود بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو آج معززین میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن در حقیقت اس سے بھی زیادہ گناہ گار ہیں۔''

تینوں لوہاروں نے یک زبان ہو کے کہا، ''یہ تو سچ ہے۔''

اس نے سلسلہء کلام جاری رکھا، ''میں جانتا ہوں کہ بیچاری اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت جاری رکھنے کے لئے کتنی دشواریوں کا سامنا کر رہی ہے۔ اور ان سالوں میں نجانے کتنی مرتبہ ندامت اور پشیمانی کے آنسوٗ بہا چکی ہے۔ اس کو تو کسی نے گرجا گھر کے علاوہ کہیں اور آتے جاتے تک نہیں دیکھا۔ اس کی حالتِ زار تو صرف خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

دوسرے پھر یک زبان ہو کر بولے، ''یہ تو سچ ہے۔''

چند لمحوں تک سب خاموش کھڑے رہے۔ بھٹی کے شعلوں کو بھڑکانے والی دھونکنی کی آواز کے علاوہ اور کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔

فیلیپؔ سیموںؔ کی جانب مڑا اور جھک کر اس سے کہنے لگا، ''جاؤ اور اپنی ماں سے کہو میں آج شام ان سے بات کرنے آؤں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے بچے کو کندھوں سے پکڑ کر باہر کی جانب روانہ کر دیا۔ پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور ایک مرتبہ پھر پانچ ہتھوڑوں کی ضربوں سے لوہار خانہ گونج اٹھا۔ وُلکانؔ دیوتا کی مانند طاقتور، مضبوط اور اپنے کام سے مطمئن وہ رات گئے تک لوہا تپاتے اور ڈھالتے رہے۔ لیکن جیسے کسی تہوار کے روز کلیسا کے گھنٹے کی آواز دوسری تمام گھنٹیوں کی آوازوں پر حاوی ہو جاتی ہے اسی طرح فیلیپؔ کے ہتھوڑے کی آواز دوسرے ہتھوڑوں کی آواز پر غالب آتی رہی۔ شعلوں کی لپک اور اڑتی ہوئی چنگاریوں کے درمیان وہ اپنے کام میں محو کھڑا رہا۔

آسمان پر جگمگاتے ستاروں کی چادر پھیل چکی تھی جب اس نے لابلانشوؔط کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ وہ صاف ستھری قمیص، اتوار کے روز پہنے جانے والے کوٹ میں ملبوس تھا اور اس کی ڈاڑھی قرینے سے ترشی ہوئی تھی۔ عورت نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولی،

''موسیو فیلیپؔ! اتنی رات ڈھلے میرے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور وہ متذبذب انداز میں عورت کے سامنے کھڑا رہا۔ وہ بولتی گئی۔

''آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں اب گاؤں والوں کی مزید طعن و تشنیع برداشت نہیں کر سکتی۔''

فیلیپ بول اٹھا، ''اگر تم میری بیوی بن جاؤ تو مجھے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

اسے عورت کا کوئی جواب سنائی نہ دیا۔ لیکن اسے اندھیرے دروازے میں کسی کے گرنے کی آواز ضرور سنائی دی۔ وہ فوراً اندر داخل ہوا۔ اندر بستر میں دبکے آنکھیں بند کئے سیموں کو ایک بوسے کی آواز اور چند لمحوں بعد اپنی ماں کی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ پھر یک لخت اسے احساس ہوا کہ اس کے نئے باپ نے اسے اپنی ہرکیولس جیسی مضبوط بانہوں میں اٹھالیا اور کہنے لگا، ''تم کل اپنے سب ہم جماعتوں کو بتا دینا کہ تمہارا باپ فیلیپ ریمی لوہار ہے اور اگر کسی نے تمہاری جانب آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو فیلیپ ریمی لوہار اس کے کان جڑ سے اکھیڑ دے گا۔''

دوسرے دن سکول میں جب سب لڑکے اکٹھے ہو چکے تھے اور کلاس شروع ہونے کو تھی سیموں کھڑا ہوا اور زرد چہرے اور لرزتی ہوئی لیکن بالکل صاف آواز میں بولا، ''میرا باپ فیلیپ ریمی لوہار ہے اور اس نے کہا ہے کہ جو بھی لڑکا مجھے تنگ کرے گا وہ اس کے کان جڑ سے اکھیڑ دے گا۔''

اب کسی نے ہنسنے کی جرأت نہ کی کیونکہ فیلیپ ریمی لوہار کو سب بہت اچھی طرح جانتے تھے اور اس کا بیٹا ہونا دنیا کے کسی بھی لڑکے کے لئے قابل فخر بات تھی۔

ہر چیز ویسے ہی پر ملال انداز میں ایک لامتناہی دائرے میں گھوم رہی ہے۔ جیسے میں اپنے دروازے میں چابی گھماتا ہوں۔۔۔ جس جگہ ہمیشہ ماچس کی ڈبیہ پڑی ہوتی ہے۔۔۔ کمرے کی بتی جلاتے ہی سب سے پہلے میری نظر جس چیز پر پڑتی ہے۔۔۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کھڑکی سے باہر چھلانگ ماردوں کہ شائد اسی طرح ان واقعات سے جان چھوٹ جائے جن سے ویسے نجات ناممکن ہے۔ ہر روز صبح شیو بناتے ہوئے میرے دل میں اپنا گلا کاٹ ڈالنے کی ایک شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور گالوں پر صابن لگا ہوا میرا چہرہ جسے میں روزانہ آئینے میں دیکھتا ہوں۔۔۔ ہمیشہ وہی۔۔۔ نجانے کتنی مرتبہ اسے دیکھ کر میں مایوسی سے رو دیا۔

اب مجھے ان لوگوں سے ملنے سے نفرت ہوگئی ہے جن کو میں کبھی بہت گرمجوشی اور اہتمام سے ملا کرتا تھا۔ میں ان کو اتنی اچھی طرح سے جان چکا ہوں کہ اب مجھے علم ہوگیا ہے کہ وہ کیا کہنے والے ہیں اور میں کیا جواب دوں گا۔ ان کی ایک ایک سوچ جس سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے میں اس سے واقف ہوں۔ ان کے استدلال کا کوئی پہلو میرے لئے نیا نہیں ہے۔۔۔ ہر ذہن کسی سرکس کی مانند ہے جس میں وہی ایک بیچارہ گھوڑا ایک ہی گول چکر میں لگاتار دلکی چال چلتا رہتا ہے۔۔۔ ہم کچھ بھی کر لیں۔۔۔ کوئی بھی راستہ اختیار کر لیں۔۔۔ انجام وہی ہوتا ہے۔۔۔ کسی پردے کے پیچھے کوئی غیر متوقع چیز نہیں ہوتی اور کوئی دروازہ کسی نئی راہ پر نہیں کھلتا۔ ہر ایک کو ایک گول چکر میں لگاتار گھومتے رہنا ہے۔۔۔ انہی خیالات کے گرد۔۔۔ انہی خوشیوں کے گرد۔۔۔ وہی لطف و مزاح۔۔۔ وہی عقائد۔۔۔ وہی بے کیفی۔



اس مجموعے میں شامل ایک ناولٹ "چکنی" اور چودہ کہانیاں موپاساں کے دو مجموعوں "Boule de Suif et Autres Contes normandes" اور "Contes du jour et de la nuit" سے لی گئی ہیں۔ "چکنی" ایک ایسی طوائف کی داستان ہے جو سماج کے ٹھیکیداروں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے جن کا مقصد حیات اپنی سماجی اور معاشی حیثیت (دولت، مذہب اور نظریات) کو ہر حال میں برقرار رکھنا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں فرانس پر جرمن یلغار کے پس منظر میں لکھے گئے اس ناولٹ میں ان استحصالی امراء، شرفاء، کلیسا کے عہدیداروں اور قومیت پرستوں کی تصویر کشی کی گئی ہے، جو سماج کے ایسے طبقوں سے، جنھیں عموماً حقارت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے، اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے قربانیوں کی توقع کرتے ہیں۔

اس کتاب میں شامل بقیہ کہانیاں موپاساں کے طرز تحریر کی آئینہ دار قرار دی جا سکتی ہیں جن میں انسانی جذبات کے تاریک ترین نہاں خانوں کو کریدا گیا ہے۔ انسانی برتاؤ اور فیصلوں پر بیرونی اثرات کے برعکس دوسرے انسانوں کے فیصلوں کا کیا اثر ہوتا ہے، موپاساں کے کردار انھی بلندیوں اور پستیوں کے عکاس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موپاساں کے کردار افسانوی اور رومانوی نہیں ہیں بلکہ ہمارے ارد گرد دکھائی دینے والے جیتے جاگتے لوگ ہیں۔

Pakistan Rs. 395

ISBN 969-650-167-6

www.alhamra.com